

کتاب

قیمت
۸۰

پیشکش

تصانیف نیاز پختوری

نگار

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور انشائوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو جہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد معنائین فہر زبانوں میں منتقل کر کے۔

قیمت دو روپیہ (ع) علاوہ محصول

جاستان

ادبی نگار کے مقالات ادبی کا دورہ مجموعہ جس میں ۲۲۰ افسانے شائع کیے گئے ہیں۔ زبان قدرت بیان میں تخلیق اور پاکیزگی خیال کے بہترین شواہد کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسائل کا حل بھی آپ کو اس مجموعہ میں نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزہ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔

قیمت چار روپیہ (ل) علاوہ محصول خریداران نگار سے ایک روپیہ کم

مکتوبات نیاز

ادبی نگار کے تمام وہ خطوط جو نگار میں شائع ہوئے ہیں پندرہ جہ شائع نہیں ہو سکے۔ جذبات نگاری اور سلاست بیان رنگینی اور لہجہ کی لاف سے فن انشائیں بالکل پہلی چیز ہے جس کے ساتھ خطوط غالب بھی پیچھے محسوس ہوتے ہیں یہ تصویر حضرت نیاز ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر مجلد شائع ہوئی ہے۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنے (پ) علاوہ محصول

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عظیم الشان افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ میرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس کی زبان اس کی تحسین اس کی نزاکت بیان اس کی بلندی مضمون اور اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہنچتی ہے۔

قیمت ایک روپیہ (ع) علاوہ محصول

اردو شاعری

یعنی جنوری ۳۵ء کا نگار جس میں اردو شاعری کی تاریخ، اسکی عہد بہ عہد ترقی اور ہر زمانہ کے شعراء پر بیسٹ نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔ مع انتخاب کلام اس کی موجودگی میں آپ کو کسی اور تذکرہ دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور جس میں سات مضامین ادبی نگار کے لکھے ہوئے ہیں حجم ۲۵۶ صفحات - قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

ہندی شاعری

یعنی جنوری ۳۵ء کا نگار جس میں ہندی شاعری کی تاریخ اور اس کے تمام ادوار کا بیسٹ تذکرہ موجود ہے اس میں تمام مشہور ہندو شعراء کے کلام کا انتخاب مع ترجمہ کے درج ہے۔ ہندی شاعری کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ مقصود ہو تو اردو میں آپ کے لئے صرف یہی ایک مجموعہ کافی ہے۔ قیمت علاوہ محصول چار روپیہ

”نگار“ جنوری ۳۵ء

(۱) ”ڈرامہ اصحاب کہف“ ڈرامہ صری انشا پر داز توفیق الیوم کی کتاب ”اہل الکہف“ سے ماخوذ و مقبس ہے اور نہایت ہی اسی چیز ہے جو آپ کے ذوق انشائی میں کو آسودہ کرنے والی ہے۔ اس کے علاوہ (۲) اسکر وائلڈ کے خطوط جو اس نے سارہ (مشہور ایکٹریس) کو لکھے تھے اور جو نیا لے ادبی انشاء میں خاص مرتبہ کی چیز سمجھے جاتے ہیں۔ ڈرامہ اپنے طرز انشاء و قدرت بیان کے لحاظ سے اردو میں جس مرتبہ کا شخص شاعر ہوتا تھا اس کا اندازہ آپ ان خطوط سے کر سکتے ہیں (۳) ”مسئلہ خلافت و امامت“ آزاد خیال مصلحی کے قلم سے مسئلہ خلافت و امامت کا قدیم و جدید دلائل بھی پھر بھی اس سلسلہ تحقیق و جستجو میں بعض اہل باتوں کے لکھے گئے اس کا جو حصہ مفاد بہت ہی کوئی صورت پیدا ہو سکے۔ چنانچہ اس سلسلہ کا یہ بانچوال مقالہ جو اس کے بعض عنوان ہیں۔ مسئلہ خلافت کے مبادی و عقائد نفس مسئلہ خلافت۔ مسئلہ خلافت کے شروع و جزئیات وغیرہ صفحات ۱۴۴ - قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

نگار

ہندوستان کے اندر سالانہ چندہ پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ
ہندوستان سے باہر صرف سالانہ چندہ آٹھ روپیہ یا بارہ شلنگ
ششماہی چندہ میں نگار کا جنوری نمبر بوجہ اضافہ ضخامت و قیمت شامل نہ ہوگا

ج (۳۶) جلد	فہرست مضامین جولائی ۱۹۳۹ء	شمار (۱) شمار
------------	---------------------------	---------------

۲	ملاحظات	ادریٹر
۹	زبانی نزع لسانیات کی روشنی میں	ل۔ احمد
۲۸	اشتراکیہ اور اس کا مستقبل	گلاب چند
۳۶	عزیز لکھنوی کی غزل گوئی	فضل الدین اثر ام۔ اے
۴۵	آئندہ جنگ میں کون کس کا ساتھ دے گا	ادریٹر
۴۹	عدالت	رشید احمد صدیقی
۵۶	مکتوبات نیاز	ادریٹر
۶۱	باب الاستفسار	"
۶۸	مطبوعات موصولہ	"
۷۶	منظومات	سروش۔ فطرت۔ عدم۔ کاوش۔ فراق۔ انجسم

نگار

اڈیسٹر:- نیاز فتحپوری

جلد (۳۶)	جولائی ۳۹ء	شمار (۱)
----------	------------	----------

ملاحظات

ہمارے علماء کرام کے لئے ایک لمحہ فکریہ

۳ جون ۳۹ء کا دن، جمعیتہ العلماء کی تاریخ میں غالباً بالکل پہلا دن تھا کہ اس نے سامنے بالکل نئی قسم کا خطبہ صدارت پڑھا گیا اور اگر اس کو علماء کی جماعت نے پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھا جس کا بڑی حد تک یقین ہے تو اس نوع کے مخاطب کا غالباً یہی آخری دن بھی ہوگا۔

مولانا عبید اللہ سندھو نے، جو اپنی عمر کا بڑا حصہ جلا وطنی میں بسر کر چکے ہیں اور جنہوں نے دنیا کی سیاسیات کا مطالعہ براہ راست انھیں ممالک میں جا کر کیا ہے جو مختلف تحریکات کا مرکز ہیں جس سادگی کے ساتھ اپنا مدعا علماء ہند کے سامنے پیش کیا ہے اور جو ابیر انھوں نے ہندوستان کی آزادی و ترقی کے لئے ظاہر کی ہیں، وہ اصول کے لحاظ سے تقریباً وہی ہیں جسے یہاں کے بعض ملحد و بیدین عرصہ سے ظاہر کرتے چلے آ رہے ہیں، اس لئے ہمیں امید نہیں کہ یہاں کے علماء کرام اسے نظر استہسان سے دیکھیں گے، لیکن چونکہ مولانا عبید اللہ قال کے انسان نہیں بلکہ

حال کے ہیں اور انھوں نے اپنے وطن سندھ میں ان تدابیر کو عملی صورت میں لانے کا فیصلہ کر لیا ہے، بنا براں ہکو توقع ہو کہ سو پہ بنگال میں علماء ہند کا یہ اجتماع بالکل رایگاں نہ جائے گا اور جو کچھ مولانا عبید اللہ نے کہا ہے اس کی اہمیت آج نہیں تو کل ہمارے علماء کی سمجھ میں آئے گی۔

مولانا نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتا جب تک یورپین اصول پر نیشنلزم نہ پیدا کی جائے اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک سیاسی جدوجہد کا آلہ کار نہ ہو۔ ان کی رائے میں اس مقصد کی تکمیل اس طرح ہو سکتی ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کو جملہ سیاسیات ہند کا مرکز بنادیا جائے اور وہ فقط اقتصادی ترقی کو آزادی کی بنیاد قرار دیکر مغربی اصول پر قومیت کو یہاں رواج دے۔ قومیت کا مغربی اصول کیا ہے، اس کی مثال میں انھوں نے ترکی قوم کو پیش کیا ہے جہاں کا مزدور و کاشتکار بھی اپنے معیار زندگی میں کسی یورپین باشندہ سے کم نہیں۔

مولانا کی رائے ہے کہ ہندوستان یورپ کے بین الاقوامی اجتماع کی نگاہ میں اسی وقت عزت حاصل کر سکتا ہے جب وہ اپنی معاشرت میں انقلاب پیدا کر کے اسے یورپ کی سطح تک لے آئے۔ اس کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک اقتصادی ترقی اور دوسرے عام تعلیم۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں حصول آزادی کے بعد حاصل ہوتی ہیں یا ان کے ذریعہ سے آزادی حاصل ہوتی ہے مولانا نے اس سے بحث نہیں کی اور نہ ان کے خطبہ صدارت میں غالباً اس بحث کا موضوع تھا تعلیم کو عام بنانے کے سلسلہ میں وہ رومن حروف کے رواج کے حامی ہیں اور لباس کے لئے کوٹ پٹاؤں تجویز کرتے ہیں۔ چنانچہ اپنے وطن سندھ میں انھوں نے اس تحریک کے عملی آغاز کا ارادہ کر لیا ہے۔

انھوں نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ سیاسیات کو مذہب سے علیحدہ رکھنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم بیدین ہو جائیں لیکن یہ ضرور ہے کہ مذہب کا دائرہ اس قدر تنگ نہ ہونا چاہئے کہ سوائے مخصوص شکل و صورت رکھنے والے حضرات کے کسی اور کو اس میں اذن باریابی ہی نہ ملے۔ موصوف کے نزدیک مذہب کا تعلق صرف بعض متعین رسوم و قیود سے ہونا چاہئے، بلکہ اس کا ایک فلسفہ ہونا چاہئے تاکہ وہی لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور اس صورت میں ممکن ہے کہ ہندوستان کے تمام مختلف مذاہب کسی ایک مرکز پر پہنچ کر اشتراک عمل کو سیکیں۔ مولانا نے فرمایا کہ مذہبی مراسم کو قومی تحریک کا جزو بنانا خواہ وہ کتنی ہی نیک نیتی سے ہو مآک کو تباہی سے نہیں بچاتا۔

فاضل صدر نے جس فلسفہ کو مسلمانوں کے لئے پسند کیا ہے اور جس کی ترویج کے لئے وہ ایک باقاعدہ درس گاہ جامعہ ملیہ دہلی میں قائم کرنا چاہتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب کا فلسفہ ہے۔ شاہ صاحب عہد آخر کے بہت بڑے امام تھے اور ہر چند مجھے اس سے اختلاف ہے کہ بجائے ایک نیا فلسفہ پیش کرنے کے جو ہماری موجودہ ضروریات پر حاوی ہو، شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کا اتباع کیا جائے جو یقیناً سب کے لئے تسلی بخش

نہیں ہو سکتا، تاہم یہ واقعہ ہے کہ مذہب کی موجودہ جکڑ بندیوں سے آزاد ہونے کے بعد قریب ترین جائے ٹٹا ہمارے لئے وہی ہو سکتی ہے اور ممکن ہے کہ اس صورت میں چند علماء ایسے مل جائیں جو اس باب میں مولانا عبید اللہ کے ہم آہنگ ہو سکیں۔ جمعیتہ العلماء کو وہ دو گروہ میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں ایک وہ جو علوم دینیہ کا محافظ ہو اور دوسرا اسلامی فلاسفی کا۔ پہلا گروہ سیاسیات سے علیحدہ رہیگا اور دوسرا کانگریس میں شریک ہوگا۔

علوم دینیہ کے سلسلہ میں انھوں نے بتایا ہے کہ کس قسم کی کتابیں پڑھانا چاہئے اور فلسفہ اسلامی سے مراد ان کی وہ ہندو فلسفہ ہے جسے ہمارے یہاں کے صوفیہ نے اختیار کیا اور جو فلسفہ شاہ ولی اللہ کا اساس و بنیاد ہے انھوں نے مغربی سائنس و صنایع سیکھنے پر بھی زور دیا ہے لیکن انگریزی زبان میں، کیونکہ عربی زبان کو اس کا ذریعہ بنانا گویا نقل در نقل ہوگی اور ہندوستانی زبان نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی کہ مغربی علوم اس میں نقل ہو سکیں اس رسم خط کے متعلق بھی انھوں نے اظہار خیال کیا ہے اور وہ یہ کہ مسلمانوں کی زبانیں عام طور پر عربی رسم خط میں لکھی جاتی ہیں، کاروباری عوام کے لئے چونکہ اس کا سیکھنا آسان نہیں اس لئے خاص طور پر مقطع حروف کا رسم خط ایجاد کرنا ہوگا جو اعراب و علامات و قطعہ کی اصلاح کے بعد افغانستان، ترکستان، ایران اور عربی ممالک میں بھی بآسانی رواج پذیر ہو سکتا ہے۔ لیکن جب وہ ایک جگہ رومن حروف کے رواج کی سفارش کر چکے ہیں تو پھر اس جدید رسم خط کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ اگر اس خیال کا باعث یہ اندیشہ ہے کہ علوم دینیہ کی کتابوں خاص کر قرآن شریف کو رومن حروف میں لکھنا لوگ پسند نہ کریں گے تو رسم خط بدلنے کی صورت میں بھی یہی اندیشہ باقی رہتا ہے، کیونکہ جو مسلمان رومن حروف کو پسند نہ کریں گے وہ اس کے بھی مخالف ہوں گے کہ مرد جو رسم خط کے علاوہ (جو ان کے نزدیک الہامی رسم خط ہے) کسی اور رسم خط میں قرآن کو منتقل کیا جائے۔

انھوں نے قرآن مجید کی بھی ایسی حکیمانہ تفسیر کی ضرورت بتائی ہے جو غیر مسلموں کے سامنے پیش کی جاسکے اور دیگر علوم دینیہ کا بھی ایک اجمالی نصاب ایسا پیش کیا ہے جو نسبتاً زیادہ آسان زیادہ سمجھا ہوا اور بر محل ہے دارالعلوم دیوبند کو وہ علوم دینیہ کا مرکز بنانا چاہتے ہیں اور فلسفہ اسلام کا درس دینے کے لئے انھوں نے جامعہ ملیہ دہلی کو تجویز کیا ہے۔

یہ ہے اجمالی خاکہ ان تدابیر کا جو مولانا نے موصوف نے ہمارے علماء کرام کے سامنے پیش کی ہیں اور جن کی وساطت سے ان کو انقلاب پسندی کی دعوت دی ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اس فرقہ زدہ دسے کوئی ایک بھی اٹھنے والا نہیں اور وہ قیامت تک قدامت پسندی و روایات پرستی سے ہٹ کر کوئی نئی بات قبول نہیں کر سکتے۔ اور قبول کرنے کی صورت بھی کیا ہے جبکہ مولانا نے ان کے عامہ و عبا پر حملہ کر کے کوٹ پتلون پہننے کا مشورہ دیا ہے اور ہیٹ کے استعمال کو ضروری قرار دیا ہے۔ ہیٹ اتار کر ننگے سر پوٹ سمیت ناز پڑھ لینا،

افغانستان میں رائج ہو تو ہو، لیکن ہندوستان کا مولوی کبھی اس بدعت کو گوارا نہیں کر سکتا اور اگر عبدالماجد دریا بادی کی سی ذہنیت رکھنے والے چوب خشک قسم کے مذہبی علمبرداروں نے یہ اعتراض کر دیا کہ کیا قرآن اولیٰ کے مسلمانوں نے کوٹ پتلون اور ہیٹ ہی پہن کر ترقی کی تھی اور کیا یہ تشبہ بالکفار نہیں ہے تو اس کا جواب مولانا عبید اللہ کے پاس کیا ہوگا۔

مولانا موصوف نے علوم دینیہ کے سلسلہ میں جو مشورہ دیا ہے وہ بھی اس لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا کہ اس سے وہ مخصوص ذہنیت جو مسجد کے امام و موزن میں پائی جاتی ہے، پیدا ہوتی نظر نہیں آتی اور فلسفہ شاہ ولی اللہ تو خیر گوارا ہی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس میں دوزخ و جنت کے مفہوم کو غیر مادی قرار دینے میں سخت ناروا جسارت سے کام لیا گیا ہے۔

رسم خط کے متعلق ان کی یہ تجویز کہ عام کتابیں رومن حروف میں لکھی جائیں، ممکن ہے ایک حد تک گوارا ہو جائے لیکن قرآن مجید کے لئے کوئی نیا رسم خط جاری کرنا کبھی قابل قبول نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کی الہامی حیثیت صرف مفہوم یا الفاظ ہی سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کے ایک ایک حرف ایک ایک نقطے، ایک ایک دایرہ سے وابستہ ہے اور اس لئے اس میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا، گویا خدا پر نکتہ چینی کرنا ہے اور خدا پر نکتہ چینی الحاد و کفر ہے یہ اور اسی قسم کے بہت سے اعتراضات ہیں جو مولانا عبید اللہ سندھی کی پیش کردہ تدابیر پر کئے جائیں گے اور مجھے امید نہیں کہ دارالعلوم دیوبند بھی جہاں خود انھوں نے تعلیم پائی ہے مولانا محمود حسن مرحوم کی یادگار میں ایسی بدعات کی تردید کو جائز قرار دے گا۔ لیکن مسلمان نام نہ مولویوں کا ہے اور نہ ان مذہبی اجارہ داروں کا جو ہماری دینی تعلیم گاہوں پر قبضہ کئے ہوئے ہیں، اس لئے مولانا کا خطاب گویا ہر مولویوں سے ہے لیکن ان کا مقصود تمام مسلمانوں کو دعوت انقلاب دینا ہے اور اس لئے یہ ضروری نہیں کہ جب کوئی مولوی ہی علم لیکر اٹھے تو اس دعوت کو قبول کیا جائے ورنہ خاموشی اختیار کی جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ہمارے علماء میں سے بعض کے دلوں میں ملک کو آزاد کرانے کی تڑپ پائی جاتی ہے، لیکن عام مسلم پبلک کو اس مقصود کی طرف لانے کی کوئی کوشش انھوں نے نہیں کی ہے اور اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ خود اپنے اندر صحیح انقلابی روح پیدا نہیں کر سکے جب کوئی قوم پستی کی انتہائی منزل پر پہنچ جاتی ہے تو اس کے ابھارنے کے لئے جس ذہنی انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے وہ آسانی سے پیدا نہیں کیا جاسکتا، اسکے لئے جسم و روح، ظاہر و باطن دونوں میں تغیر کی ضرورت ہوتی ہے اور یہی وہ فلسفہ تھا جس کی بناء پر کمال اتاترک نے ترکی میں اور رضا شاہ پہلوی نے ایران میں معاشرت و لباس کو بالکل بدل دیا۔

ماحول کا اثر انسان پر بہت پڑتا ہے اور قریب تر ماحول انسان کا اس کی معاشرت ہے، اس کا لباس ہے

اور ان کا تغیر انسانی ذہن کا تغیر ہے۔ اس لئے مولانا عبید اللہ سندھی کا لباس و وضع، معاشرت و معیشت کی تبدیلی کا مشورہ دینا، سیاسیات کو مذہب سے علیحدہ رکھنے کی سفارش کرنا، علوم دینیہ کو حد سے زیادہ اہمیت نہ دینا، اور بجائے عقاید کے ایک ایسا فلسفہ پیش کرنے کی ہدایت کرنا جو تمام اقوام عالم کے لئے قابل قبول ہو، کیسر حکیمانہ تدبیر و تفکر ہے اور اگر علماء کرام اس کو قابل قبول نہیں سمجھتے تو ہم میں سے ہر ایک کا انفرادی فرض ہے کہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کی کوشش کرے۔

گلاب چند صاحب کے ایک مقالہ کے متعلق

گزشتہ مئی کے نگار میں ایک مقالہ گلاب چند صاحب کا شائع ہوا تھا جس میں مسٹر عبدالوحید خاں بی۔ اے کی کتاب ”جنگ آزادی اور مسلمان“ پر تبصرہ کرتے ہوئے مقالہ نگار نے بعض ایسے مسائل پر بھی بحث کی تھی جو ماہہ النزاع ہو سکتے ہیں اور جن سے مجھے بھی اختلاف ہے، لیکن اڈیٹر کا کسی مسئلہ سے متفق رائے نہ ہونا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ رسالہ میں شائع نہ کیا جائے۔ چنانچہ میں نے اسے شائع کیا اور اس خیال سے کہ جن حضرات کو اختلاف ہوگا، وہ جواب دیں گے، لیکن اس وقت تک کسی طرف سے کوئی صدا بلند نہیں ہوئی، البتہ حیدر آباد کے ایک صاحب نے جن کا اسم گرامی غلام صدیقی ہے صرف ایک خط کے ذریعہ سے اختلافی مباحث کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن کوئی جوابی مقالہ انھوں نے سپرد قلم نہیں کیا۔

گلاب چند صاحب نے اپنے مضمون میں دو باتیں ایسی لکھی ہیں جو یقیناً توجہ طلب ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کا کوئی مخصوص کلچر بھی نہ تھا اور دوسرے یہ کہ مغلیہ حکومت کے زوال میں سلطنت دکن کے بانی و موسس نے بھی بڑا حصہ لیا۔ میری رائے میں یہ دونوں باتیں غلط ہیں

اسلامی کلچر کا مفہوم صرف عربی زبان، عربی لباس اور عربی عادات نہیں ہے بلکہ وہ مجموعہ ہے نہ صرف عرب و ایران دونوں کی تہذیب کا بلکہ بعض ہندوستانی اطوار و شمایل کا بھی اور اس لئے یقیناً یہاں کے خالص ہندو کلچر سے بالکل علیحدہ تھا اور اب بھی ان دونوں قوموں کی معیشت و معاشرت کے مطالعہ سے دونوں کا فرق بہ آسانی معلوم کیا جاسکتا ہے۔ مقالہ نگار کا یہ کہنا کہ ”تہذیب و تمدن کی ذمہ داری مذہب نہیں لیا کرتا“۔ نفسیاتی غلطی ہے۔ آج تک ہندو مسلمانوں کا ایک دوسرے سے علیحدہ رہنا، باہد گرو رشتہ از دواج قائم نہ کرنا، ایک دوسرے کے ساتھ کھانا نہ کھاسکنا مانپنے لئے علیحدہ علیحدہ لباس اختیار کرنا عام طور پر ہندوؤں کی سمجھا میں صرف ہندوؤں کا اور مسلمانوں کی مجلس میں صرف مسلمانوں کا شریک ہونا، کیا یہ تمدن و تہذیب کا اختلاف نہیں ہے اور کیا مذہبی عنصربیت کو اس کا ذمہ دار قرار نہ دیا جائے گا۔

اسی طرح دوسرے مسئلہ میں بھی گلاب چند صاحب نے صحت فکر سے کام نہیں لیا۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ

بنگال کے صوبہ داروں نے خود مختاری کا اعلان کر کے مسلمانوں کی مرکزی حکومت کو نقصان پہونچایا، لیکن اودھ اور دکن کے متعلق یہ نہیں کہہ سکتے، کیونکہ جس زمانہ میں یہاں کے ناظموں نے خود مختاری کا اعلان کیا ہے، وہ مغلیہ خاندان کا آخری زمانہ تھا اور مرکزی حکومت اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ اگر یہاں کے ناظم یہ طرز عمل اختیار کرتے تو دونوں صوبے غیروں کے پاس پہونچ جاتے خصوصیت کے ساتھ دکن کی حالت تو اس درجہ نازک تھی کہ اگر چین خلیج خاں (آصف جاہ اول) ایسا نہ کرتے تو مغلیہ اقتدار کی آخری سانسیں کبھی کی ختم ہو چکی تھیں۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ باوصف خود مختاری کے بھی فرمانروایان دکن نے اس مغلیہ خاندان کے آخری دور پر انتہائی کمزور بادشاہوں کا بھی وہی احترام کیا جو اکبر اورنگ زیب کا کیا جاتا تھا اور کبھی غیر فادارانہ جذبات ان کے دل میں پیدا نہ ہوئے۔ اگر خلیج خاں یہ نہ کرتا تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ دیدہ و دانستہ دکن کی حکومت مرہٹوں کے ہاتھ میں دیدیتا۔ خلیج خاں کا یہ فیصلہ ایسا فیصلہ تھا جس نے مغلیہ حکومت کو بالکل مٹنے نہیں دیا اور جب تک خاندان آصف جاہی موجود ہے اس کی یادگار بدستور باقی رہے گی۔

بہر حال یہ دونوں مسئلے تاریخی و سیاسی حیثیت سے بحث کے قابل ہیں اور خصوصیت کے ساتھ مسٹر عبد الوحید خاں کو اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں جن کو علاوہ ان مسائل کے اور بھی بعض مسلم لگی مسائل کے متعلق گلاب چند صاحب کو جواب دینا ہے۔

حیدر آباد کا مسئلہ | زیادہ نازک صورت اختیار کرتا جاتا ہے اور اس کا ثبوت حال ہی کا وہ ہنگامہ ہے جو ایک سکھ کی موت پر آریہ سماجیوں نے وہاں بپا کیا اور جس کے فرو کرنے کے لئے پولیس کو مجبوراً سختی عمل میں لانا پڑی۔ قوم کی بیداری بڑی چیز نہیں، آزادی کی تمنا ہر شخص کا فطری حق ہے لیکن ہم دنیا کی ہر اچھی بات کو مکروہ بنا سکتے ہیں اگر اُسے بد تمیزی سے حاصل کریں اور یہی وہ ناعاقبت اندیشیہ طرز عمل ہے جو آریہ سماجیوں نے آجکل اختیار کر رکھا ہے۔

خود حیدر آباد کے اندر اس وقت تک ہندو مسلمان جس اتحاد و امن کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، اس کا حال خود ان بیانات سے معلوم ہو سکتا ہے جو وہاں کے بڑے بڑے ہندوؤں کی طرف سے شایع ہو رہے اور یقیناً وہاں کے ہندو بیرونی لوگوں کی اس ممانعت کو قطعاً پسند نہیں کرتے، لیکن اس کا کیا علاج کہ ہندوستان کی آریہ سماجی تحریک فی الحقیقت ایک سیاسی تحریک ہے جو مذہب کے نام سے چلائی جا رہی ہے اور جس کا اولین ہدف قدرگاہ حیدر آباد ہی کو ہونا چاہئے کیونکہ ہندوستان کے مسلم عہد حکومت کی تنہا یادگار ایک وہی باقی ہے۔

آریہ سماجیوں کا یہ الزام کہ انھیں وہاں مذہبی آزادی حاصل نہیں، ان کی اقلہ مادی حالت بہت

خراب ہے، ان کی تمدنی آزادی کو کچلا جا رہا ہے، اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکا اور خود ہندوؤں نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ ان الزامات کی کوئی اصلیت نہیں ہے، لیکن جتھوں کی روانگی بند نہیں ہوتی اور امن شکنی کے لئے اندرونی طور پر ریشہ دوانیاں بدستور جاری ہیں، یہاں تک کہ اگر کوئی اور موقعہ ہاتھ نہیں آتا تو سکھوں ہی کے مسئلہ کو اپنا مسئلہ بنا لیتے ہیں اور دخل در معقولات پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

یہ علامتیں اچھی نہیں ہیں اور ان کا نتیجہ یہ ہونا ہے کہ خود حدود ریاست کے اندر اسکا رد عمل پوری قوت کے ساتھ شروع ہو گا اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ بد امنی بہر حال ہندوؤں کے لئے مفید ہی ثابت ہوگی۔

حال ہی میں ہم کو متعدد خطوط حیدر آباد سے موصول ہوئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کے مسلمانوں میں اس کا کافی احساس پیدا ہو چلا ہے اور وہ آریہ سماجی تحریک کو براہ راست اپنے اوپر حملہ خیال کر کے، یکسر ان اصلاحات کے مخالف ہیں جن کا اعلان ریاست کی طرف سے ہونے والا ہے۔ ہر چند اصلاحات کا مسئلہ ایسا ہے کہ اگر آریہ سماجی تحریک نہ ہوتی، تو بھی وہاں کی حکومت کو اقتضائے زمانہ کے لحاظ سے اپنے نظم و نسق میں تبدیلی کرنا پڑتی، لیکن چونکہ بد قسمتی سے ان اصلاحات کا اعلان اس شورش کے بعد ہونے والا ہے اس لئے مسلمان اس میں تھوڑی سی بسکی محسوس کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی اندیشہ ہے کہ مبادا ان کے مفاد کو کوئی نقصان پہنچے۔

الغرض یہ ہیں وہ پیچیدگیاں جنہوں نے اس وقت نہ صرف حیدر آباد بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو متفکر بنا رکھا ہے اور عجب نہیں کہ آگے چلکر یہ مسئلہ ملک کا مستقل سیاسی سوال بن جائے۔ چنانچہ یہی کچھ سوچ کر صوبہ پنجاب نے جو آریہ سماجی تحریک کا مرکز ہے تحفظ ریاستہائے ہند کے قانون کے ماتحت جتھوں کی روانگی اور تاجان انگیز تحریروں کی اشاعت کا سد باب کرنا چاہا ہے، جس کا اتباع دوسرے صوبوں کو بھی کرنا چاہئے۔

نہایت ضروری اطلاع

ہمارے دفتر سے رسالہ نگار سر خرمیاد کو نہایت احتیاط سے بھیجا جاتا ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے پرچہ آپ کو ۱۵ اتر تک نہ پہنچے تو فوراً اطلاع دیجئے، ورنہ مہینہ ختم ہونے کے بعد بیرنگ روانہ کیا جائے گا اور آپ کو ۲۰ ادا کرنا پڑیں گے، کیونکہ جدید قواعد ڈاک خانہ کی رو سے مہینہ گزرنے کے بعد پانچ گنا محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

زبانی نزع لسانیات کی روشنی میں

لسانیات یعنی زبانوں کا فلسفہ ایک علمی مشغلہ ہے جس کا کام الفاظ کے متعلق تحقیق و تفکر کرنا ہے۔ بظاہر تو یہ ایک خشک منہمک موضوع ہوتا ہے لیکن حقیقتاً نہایت دلچسپ مصروفیت ہے، تحقیق الفاظ کا ذوق ایک مرتبہ پیدا ہو جائے تو اس چپکے سے زیادہ قومی ثابت ہوتا ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے :-

”چھپتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی“

علمی نظر سے جب دیکھا جاتا ہے تو الفاظ کے وجود میں آنے اور مفہوم اختیار کرنے کا نقشہ تو مول کے اخلاقیات کا ایک چارٹ اور ان کی زندگی کی تاریخ کا ایک گراں ہوتا ہے، اور الفاظ کے چولہا بدلنے کا طریقہ اتنا پر فرسوں اور جادو بھرا ہے کہ جسے اس کا مذاق ہو گیا پھر اس کے طلسم میں مبتلا رہنا ہی پسند کرتا ہے۔

ہماری زبان میں فلسفہ زبان کی طرف جتنی توجہ کی گئی وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ سچند ان پارس کے بعد حمید اللہ خاں صاحب جمیری کی ایک تالیف ضرور جامع کتاب کہی جاسکتی ہے، لیکن اب وہ بھی حالیہ نہیں رہی۔

اس موقع پر مجھے تحقیق الفاظ کے متعلق کوئی بحث مقصود نہیں، اور حقیقتاً میں لسانیات کا طالب علم بھی نہیں، لیکن طبیعت کو اس موضوع سے لگاؤ ضرور ہے۔ یہاں میں یہ کوشش کرنا چاہتا ہوں کہ لسانیات کے بعض بنیادی اصول کے تحت اردو و ہندی کی موجودہ چیلش کو سمجھ جائے۔ کیونکہ میرے خیال کے مطابق اس مسئلہ میں جو بحثیں کی جا رہی ہیں یکسر جذبات پر مبنی ہیں، ان کو علمی اصول سے کوئی واسطہ نہیں۔ بابائے اردو (سعدت کے ساتھ) ڈاکٹر عبدالحق کا ایک بسیط مضمون مدینہ کی ۱۳ مارچ ۱۹۳۹ء کی اشاعت میں نکلا ہے۔ آخر مضمون میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ :-

”خیال بارہا سننے میں آیا ہے کہ زبان قدرتی چیز ہے اور بنانے سے نہیں بنتی۔ اس دھوکے میں نہ رہیے گا۔

انسانی کوشش بڑی بد بلا ہے یہ ہر شکل پر غالب آجاتی ہے۔ وغیرہ“

اس وقت نفس مضمون سے محاذ مقصود نہیں لیکن ڈاکٹر صاحب کے رتبہ علم و فضل سے ہر شخص یہی توقع کرے گا کہ ان کا بحث منطقی اور علمی استدلال پیش کرے گی لیکن اس تحریر میں کسی استدلال کی تلاش حیرانی کی تلاش کے ہم معنی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ انسانی کوشش بڑی بد بلا ہے، لیکن اس کا تعلق جہاں تک ہماری زبان سے ہے، خود ڈاکٹر صاحب اپنی کوشش کو ”بد بلا“ نہ بنا سکے

اور ”جہازِ نابرقانا“ قسم کے منساد کی اختراع خود انجن ترقی اُردو کی تمام مطبوعات میں بھی روانہ رکھ سکے۔ مجھ سے زیادہ ڈاکٹر صاحب کو علم ہے کہ یورپ میں ایک بین الاقوامی زبان بنانے کی کوششیں جسے دلاچک ادما سپر ٹو نام دئے گئے، ناکام رہ چکی ہیں اور یورپ والوں کو جو ذریعہ حاصل ہیں ان کے باوجود وہ بھی اپنی کوششوں کو ”بدلا“ نہ بنا سکے۔ آج ہمارے یہاں جو لوگ ایک نئی زبان بنانے کی دُھن میں لگے ہوئے ہیں یا وہ جو اس کوشش سے سہمے جا رہے ہیں، یورپ والوں کی ان کوششوں کی تاریخ میں بہت کچھ سامانِ خرد افروزی پائیں گے۔ غرض، زبان کی بحث ایک خالص علمی چیز اور فلسفیانہ بحث ہے لیکن سیاسی مفاد کی خاطر میدانِ سیاست کی فٹ بال بنائی گئی ہے۔

جس زمانے میں ہم آپ جی رہے ہیں وہ تحقیق و تلاش کا زمانہ کہلاتا ہے اور علمی ترقیوں کا یہ زور ہے کہ کوئی بات نہیں جو سائنس نہ بن گئی ہو یا آرٹ نہ کہی جاتی ہو۔ گھڑ دوڑ کا ایک سائنس مرتب ہے اور عربی کی تصریحات آرٹ کہی جاتی ہیں۔ ایسے زمانے میں اگر ملک کے باشندوں کے درمیان زبان کے باب میں کوئی اختلاف رونما ہو یا نقطہ نظر بدل جائے تو اُسے علمی حدود کے اندر ہی سمجھنا اور طے ہونا چاہئے۔ لیکن اس کے عوض نظریہ آ رہا ہے کہ مذہب کی غلط تعبیریں کر کے مسئلے کو تعصب سے رنگا جا رہا ہے حقیقی سیاست کو پس پشت ڈال کر سیاسی اغراض کا آلہ کار بنایا جا رہا ہے۔

انسان اس زندگی کی تلخیاں ہلکی کرنے یا اُس کی گتھیاں سلجھانے پر فطرتاً ما مور و مجبور ہے کہ اسی میں اس کی راحت و مسرت پوشیدہ ہے اور راحت و مسرت کی تلاش انسانی زندگی کا راز ہے چنانچہ اس وقت تک وہ ان تلخیوں کو ہلکا کرنے یا ان گتھیوں کو سلجھانے کا ایک ہی نسخہ دریافت کر سکا ہے اور وہ حکمت و فلسفے کی نظر ہے۔ فلسفے کی روشنی میں اگر ان تلخیوں کا وجود باقی نہیں رہتا، یہ گتھیاں خود بخود سلجھ جاتی ہیں۔ پھر کس درجہ حیرت کی بات ہے کہ فلاطون و ارسطو کے فلسفے میں اصلاح دینے والے اور فلسفہ ویرانت کے موجد اُس مسئلہ میں تعصب سے کام لیں جو تعصب کو قبول نہ کرتا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ارادہ کر کے ہم زندگی کے ہر شعبے میں تعصب کو داخل کر سکتے ہیں، لیکن علم کے باب میں ارادہ و کوشش کے باوجود ایسا نہیں کیا جاسکتا۔ زبان تعصب کی چلنے ہی نہیں دیتی اور کون اہل نظر ہے جو اعتراف نہ کرے گا کہ تعصب تو وہ بری شے ہے جو اشیاء سے ان کی دلکشی چھین لیتا ہے، جو انسان کو انسانیت کے درجے سے گرا دیتا ہے۔

اس موقع پر غور و مطالعے کے لئے دو لفظ پیش کرتا ہوں۔ ڈاڑھی کا مسئلہ مسلمانوں میں مذہبی مسئلہ ہے اور اُسے ”خدا کا نور“ کہا جاتا ہے۔ پیشانی پر سجدے کے نشان کے متعلق ان کا عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز چمکتا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں چیزوں کے ساتھ مسلمانوں کے کچھ مذہبی معتقدات وابستہ ہیں۔ لیکن ان کے جو نام قبول کر لئے گئے وہ ٹھیک ہندی ہیں یعنی ”ڈاڑھی“ اور ”گھٹا“ اور ان لفظوں میں ثقالت کے بھی تمام اجزاء موجود ہیں۔ یہ نکتہ شاید مزید دلچسپی کا باعث ہو کہ لفظ ”ساڑھی“ میں سے ہم نے اور خود ہندی والوں نے بھی ثقالت کو دور کر دیا ہے اور اب عام طور سے ”ساڑھی“ بولا اور لکھا جاتا ہے لیکن ”ڈاڑھی“ اور ”گھٹا“ جوں کے توں چلے آتے ہیں۔ ان کی ثقالت دور کر دینے کا بھی ہمیں خیال نہ آیا۔ زبان کے تعصب سے بالا ہونے کی

بہت سی شہادتیں دیا ہو سکتی ہیں، لیکن اہل نظر کے لئے یہی ایک مثال کافی ہوگی۔

زبان کے موجودہ اختلاط کا لب لباب یہ ہے کہ حضرات اُردو کو خطرہ ہو گیا ہے کہ رائج اور عوام کی زبان پر چڑھے ہوئے الفاظ بھی نکالے جا کر ان کی جگہ سنسکرت کے ناانوس لفظ رائج کئے جا رہے ہیں۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی ہر چیز سے نفرت ہو گئی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہماری نسلوں کی ذہنیت ہندوانہ ہو جائے گی اور ہمارا کلچر فنا ہو جائے گا دوسری طرف پراچینی سمن کہتے ہیں کہ دیش کو ایک باقی بننے کے لئے ایک راشٹر بھاشا یعنی لنگوا فرنیکا کی ضرورت ہے اور اس میں عوام کی سمجھ کے مطابق دیسی الفاظ کی بہتات ہونا چاہئے اور سنسکرت کے الفاظ زیادہ شامل ہونے چاہئیں تاکہ دوسرے صوبے والوں کے لئے ہندوستانی آسان اور قابل فہم ہو۔

میں ان دلیلوں کے صحیح اور معقول ہونے یا نہ ہونے سے بحث نہ کروں گا، بلکہ میری کوشش یہ ہوگی کہ آیا یہ خطرات اور ضرورتیں لسانیات کی نظر میں بھی معقول و صحیح ہیں یا نہیں، اور علم و زبان کی ترازو میں ان کا کتنا وزن اُترتا ہے؟ اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زبان بننے کے نظریے کو سمجھا جائے۔

انگریز ماہرین زبان میں ٹرینچ کا بڑا مرتبہ ہے۔ لسانیات کی بحثوں میں اُس سے حوالہ ناگزیر ہوتا ہے اور کام نہیں چلتا۔ ٹرینچ سے پہلے لسانیات کی بنیاد اس نظریے پر تھی کہ دوسری ایجادوں اور صنعتوں کی طرح جن سے انسان نے اپنی زندگی کو تدریجاً سنوارا اور اُسے معقول بنایا زبان بھی ایک ایجاد اور صنعت ہے۔ اس کی شرح یوں بھی ہو سکتی ہے کہ انسان نے اس دنیا میں آکر اپنی ضرورت کے مطابق چیزیں ایجاد کیں اور بنائیں، اور پھر ان میں آہستہ آہستہ ترقی دیتا رہا اُسی طرح اُس نے زبان ایجاد کی اور اُس میں ترقی دیتا رہا، شروع میں وہ بے معنی آوازوں سے کام لیتا ہو گا، پھر خاص چیزوں کے لئے خاص آوازیں مقرر ہوئی ہوں گی، کچھ اشاروں سے مدد لی گئی ہوگی (جو وہ آج بھی کرتا رہتا ہے) اور اس طرح ترقی پاتے پاتے زبان انسانی خیالات و محسوسات کے اظہار کا حیرت انگیز ذریعہ بن گئی۔

ٹرینچ کو اس نظریے میں یہ نقص نظر آیا کہ اُسے مان لینے کے بعد زبان انسانی زندگی کا ایک "اتفاق" (Accident) قرار پاتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں ایسی انسانی جماعتوں کا تو وجود ہے جو بہت سے اُن ایجادوں اور صنعتوں سے معر اور محروم ہیں جو بمقابلہ زبان بہت کم درجے پر ضروری ہیں، لیکن ایسا کوئی گروہ انسانی نہیں پایا گیا جو مدنی ارتقاء کی ابتدائی منزلوں میں ہونے کے باوجود کوئی زبان نہ رکھتا ہو اور اُسے استعمال نہ کرتا ہو۔

چنانچہ ٹرینچ نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان کے دور وحشت و حیوانیت میں بھی اس کے اندر حیوانیت سے نکل کر مدینیت کی منزل میں پہنچ جانے کا بیج موجود تھا۔ قدرت نے اگر اس کے اندر یہ استعداد نہ رکھی ہوتی تو یا تو وہ حیوانیت ہی کی منزل میں فنا ہو گیا ہوتا یا اُس سے آگے نہ بڑھ سکتا تھا۔ یعنی انسان انسان نہ بن پاتا۔ اس لئے لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ قدرت نے انسان کو زبان بالکل اُسی طرح بخشی جس طرح اُسے عقل عطا کی۔ لفظ ہی عقل ہے اور لفظ کے آئینے میں عقل انسانی اپنی صورت دکھتی ہے

لفظ اور عقل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ یونانی زبان میں ان دونوں کے لئے ایک ہی لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ابتداء ہی میں انسان لغت اور قواعد کی کتابیں بغل میں داسے رہتا نہیں ہوا، لیکن یہ بھی اتنا ہی صحیح ہے کہ اس کے اندر چیزوں کے نام رکھنے کی قابلیت و صلاحیت موجود تھی اور اس قابلیت و استعداد کا موجود ہونا بھی ہرگز کارآمد نہ ہوتا اگر انسان کے اندر یہ فطرت بھی موجود نہ ہوتی کہ وہ اپنی اس استعداد کو برسر عمل لے آئے۔

ان دلائل کے بعد ٹریچ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ زبان نہ تو مطلقاً انسانی ایجاد اور اس کی کوشش کا نتیجہ ہے اور نہ بالکل ایک عطیہ فطرت ہے۔ زبان کے وجود میں لانے کے اندر انسان اور قدرت، دونوں کی کار فرمائی کو دخل ہے اور یہ بات فہم عامہ کے بالکل مطابق ہے۔ معمولی عقل والا بھی جب زبان کے مسئلے پر سوچنے بیٹھے گا تو پہلے اس کا خیال بچوں کی طرف جائے گا کہ بے معنی آوازوں سے کام لیتے ہیں، پھر شاید وہ بہرے گونگوں کا خیال کرے کہ اشارے ہی ان کی زبان ہیں اور بالآخر وہ اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ زبان آپ سے آپ بنتی ہے۔

”ڈاڑھی اور گھٹا“ کی مثال سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ انسانی ضرورت کے سامنے نہ تو ان کا ہندی ہونا رکاوٹ ثابت ہوا اور نہ ان کی ثقافت مانع ہوئی۔ اور ٹریچ کا نظریہ یہیں سے ثابت ہو جاتا ہے۔

مسئلے کی علمی صورت جب یہ ہو تو ایک ہی زبان کے بولنے والوں میں کسی کا یہ کہنا کہ ہماری زبان مثالی جا رہی ہے اور کسی کا یہ کہنا کہ تجھیں اپنی بھاشا کو پروان چڑھانے کا حق ہے، نہایت مہمل اور خلاف عقل بحثیں قرار پاتی ہیں۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہ ہونا چاہئے کہ بعض علماء نے صرف دو ہی طاقتوں کو مطلق مانا ہے۔ اس میں ایک تو محبت کا جذبہ ہے جس سے اس وقت ہمیں واسطہ نہیں، دوسری علم کی طاقت ہے جو ہماری اس گفتگو کا محور ہے۔

ظاہر ہے کہ علم کا کوئی مذہب نہیں، ہر چند کہ مذہب کا علم اپنی جگہ پر ہے۔ علم اس کا ہے جو اسے حاصل کرے۔ زبان کا بھی ایک علم ہے، زبان ان کی ہے جو اسے بولیں۔ آغاز میں جن لوگوں نے چہرے پر ”اللہ کے نور“ اور پیشانی پر ”کوہ نور“ کے لئے ”ڈاڑھی اور گھٹا“ کے لفظ قبول کر لئے وہ بہر حال آج کل کے مسلمانوں سے بہتر مسلمان تھے، اس لئے کہ قرن اول سے کئی سو سال قریب تر تھے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کے ذہن میں ”ہماری تمھاری“ زبان کا کوئی تخیل ہو سکتا تھا۔ ان کے ذہنوں میں اگر اس خیال کا شائبہ بھی ہوتا تو ہندوستان کی لنگوافر زبان کا وجود میں نہ آ سکتی تھی۔ بلکہ پرانی کہادت کے مطابق پانی کے ہوتے ہوئے ”آب آب“ کہتے مر جاتے۔

اب چونکہ زبان کے بننے میں انسان کا بھی ہاتھ ہے اس لئے زبان کا پھولنا پھلنا اس کے بولنے والوں کی ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت ہوگا اور چونکہ زبان کے وجود پذیر ہونے میں قدرت کی کار فرمائی بھی شامل ہے اس لئے جب حالات و اسباب بدلیں گے زبان میں تبدیلی آجانا لازمی بات ہے اور چونکہ یہ کارخانہ دنیا کا ہمیشہ ہی تغیر پر ہے تو زبان کی تبدیلی کو روک سکتا انسان کی قدرت میں بھی نہیں۔ علم زبان کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ ماہرین لسانیات نے یہ کلیہ تسلیم کر لیا ہے کہ تیس سال کی

دست میں زبان کے اندر تبدیلی ہو جاتی ہے۔ الفاظ کے مفہام میں کمی بیشی ہوتی ہے، کچھ الفاظ ترک ہو جاتے اور کچھ داخل ہو جاتے ہیں۔

ضرورت اور تقاضے کی گفتگو میں یہ تاریخی حقیقت بصیرت افروز واقعہ ہے کہ سلطان محمود کے عہد کے کچھ کے حال میں محکمہ آثار قدیمہ نے برآمد کئے ہیں جن پر کلمہ شریف کا سنسکرت ترجمہ دیوناگری حروف میں ٹھیکہ کیا گیا تھا۔ یہ واقعہ اپنی حیرت کا حامل ہے، لیکن اس ذکر میں حیرت کے لئے بڑی گنجائش باقی ہے۔ بسم اللہ کا ترجمہ ”اؤکے تیا نہ“ رسول کا ”اوتار“ اور محمد کا ”جینا“ کیا گیا ہے۔ بودھ اور جین متوں میں ”جینا“ معلم اول کا لقب ہے۔ سلطان محمد کے بعد سے مر لھویں صدی عیسوی تک مسلم بادشاہوں کے سکوں پر دیوناگری ٹھیکہ ہوتی رہی۔ ”تغلق عہد میں ایک سکے پر ”شری سلطان غیاث الدین“ ضرب ہوا۔ اور محمد تغلق کے روپے پر ایک طرف نکشی دیوی کی تصویر ضرب ہوئی تھی۔

میں واقعی شمس ہوں کہ ۹ مئی ۱۳۳۸ء کو جب محکمہ آثار قدیمہ نے شملہ سے یہ بیان نکالا تو اسے پڑھ کر بعض مسلمانوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی؟ سلطان محمود کے ساتھ علیہ الرحمۃ کہا گیا ہو گا یا اور کچھ؟ محمد تغلق کو کیا خطاب دیا گیا ہو گا؟ اگر اس کے عہد کے مسلمانوں کی ذہنیت وہ ہوتی جو آجکل ہے تو ان بادشاہوں کی کیا گت بنی ہوتی؟

ذہنیت کے ہندوانہ ہو جانے اور کلچر مٹ جانے کے متعلق ان چیزوں کے اجزائے ترکیبی کو سمجھ لینا ضروری ہے۔ اور نہ کسی منطقی نتیجے تک نہیں پہنچا جاسکتا۔

اُردو زبان کا جائزہ لیا جاتا ہے تو اس میں تقریباً اسی فیصدی الفاظ ہندی کے نظر آتے ہیں (افعال سو فیصدی ہیں) اور قواعد بھی کم و بیش یکساں ہیں۔ زبان اور الفاظ کے متعلق اس کے نکتے کو سمجھ لینا چاہئے الفاظ داخل ہونے کے بعد ذہنیت کو متاثر نہیں کرتے بلکہ ذہن کے اندر ان الفاظ کو قبول کرنے سے پہلے اتنی گنجائش پیدا ہو چکتی ہے۔ مولانا حالی انگریزی ذہنیت کے انسان نہ تھے لیکن انھوں نے بعض انگریزی لفظ استعمال کئے جو آج بالکل غیر ضروری نظر آتے ہیں مگر اس وقت ان کی ذہنیت ان لفظوں کے قبول کے لئے طیار تھی اور اس وقت ان کی ضرورت بھی تھی۔ غرض، یہ اسی فیصدی ہندی الفاظ ہمارے اسلاف کی ضرورتوں اور تقاضوں نے اختیار کئے اور ان کی اتنی بڑی تعداد ہماری ذہنیت کو ہندوانہ نہ بنا سکی (یہ مفروضہ ہے وہ نہ میرا خیال اس کے برعکس ہے)

ظاہر ہے کہ کلچر زبان سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ کلچر کی نمائش سب سے پہلے ہماری گفتگو میں ہوتی ہے۔ میں اگر ”آپ“ کی جگہ ”تو“ یا ”تم“ کہوں اور ”جی“ کے بدلے ”ہو“ یا ”ہاں“ بولوں تو یقیناً آپ مجھے شایتہ و مہذب انسان نہ کہیں گے پھر کیا اس صورت حال کو تعجب انگیز نہ کہا جائے گا کہ وہ دو لفظ جن کو میں ہر وقت استعمال کرتا اور اپنی شائستگی کا ثبوت دیتا ہوں ہندی الاصل ہیں؟ کلچر کو سمجھنے کے لئے ہمیں اپنے تہوار اور تقریبوں پر نظر ڈالنا اور ان الفاظ کو دیکھنا چاہئے جو اس وقت بولے جاتے ہیں۔

عام مسلمانوں میں شبِ برات جو خالص اسلامی تہوار ہے، جس طرح منائی جاتی ہے اُس میں ہندوؤں کی شرادھ یا کائناتوں میں زیادہ فرق نہیں، پُرکھوں کو پانی دونوں جگہ دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں بیوی کی صحنک کی رسم بالکل وہی ہے جیسے ہندو عورتیں جو کچھ جلاتی ہیں۔ تعزیتہ داری کے اندر رام لیلہ کی نقل کے بہت سے آثار ملتے ہیں۔ کالادانہ اُتارنا اور ٹوٹے ٹوٹے ہندو مسلمانوں میں بالکل یکساں ہیں۔ ہندوؤں میں جس طرح مرض یا آسیب جھاڑا، بے مسلمان پیر اور صوفی بھی اُسی طرح جھاڑتے ہیں۔ پیدائش سے پہلے، پیدائش کے وقت اور پیدائش کے بعد کی رسمیں دونوں میں مشترک ہیں بچے کا نال یکساں طور پر کاٹا جاتا ہے، دورانِ حمل میں ستوانسا یعنی ساتویں مہینے کی رسم دونوں جگہ ایک ہے، گود بھرائی جاتی ہے۔ پیدائش کے بعد اچھوانی اور سٹورا دونوں گھروں میں بتا ہے، ددلوں کے بچے گھٹی ہی پتے ہیں اور یہ چیزیں اپنے ناموں سے سچائی جاسکتی ہیں۔ زہ کو چھٹی یکساں طور پر بھلائی جاتی ہے اور تارے بھی ایک ہی طرح دکھائے جاتے ہیں۔ شادی کی رسموں میں نسبت یا منگنی، لگن پڑنا یا تاریخ مقرر کرنا، دونوں میں ہوتا ہے۔ شادی کے وقت سہرا اور لگنا باندھا جاتا ہے، چھڑیاں اور اُٹھن کے گولے مارے جاتے ہیں اور یہ رسمیں دونوں فرقوں کے عوام و خواص میں جاری ہیں۔ شادی کی رخصت کو رسمِ عوام بھی کہتے ہیں اور بہن بیٹی کو ”بدائی“ دی جاتی ہے۔ برات کی رخصت کے وقت ”دودھا بھاتی“ کی رسم عام ہے۔ بعض جگہ نام بدل گئے ہیں۔ بیٹی کے گھر کھانے سے دیہاتی مسلمان اب تک پرہیز کرتا ہے۔ موت کی رسموں میں تیسرے دن کی قرآن خوانی کو پھول اور تہجہ ہی کہا جاتا ہے۔ دسواں، بیسواں، چالیسواں اور چھبائی سب ہندی لفظ ہیں۔ موت کا کھانا مسکینوں کو اسی طرح کھلایا جاتا ہے جیسے بن جنائے جاتے ہیں۔ اُٹھان، پیدائش، شادی اور موت کی بیشتر رسمیں مشترک ہیں۔ اب اور طرف بھی نظر ڈالئے۔

سجد کے گنبد پر وہی کلس نظر آتا ہے جو قریب کے مندر پر دکھائی دیتا ہے۔ وضو کے برتن کو لوٹا یا بدھنا ہی کہا جاتا ہے اور یہ سب ہندی کے لفظ ہیں، کلس تو خالص ہندوؤں کی ایجاد ہے۔ تعزیتے کے اوپر کا حصہ چھتری کہلاتا ہے، حالانکہ ہندوؤں میں چھتری اُس عمارت کو کہتے ہیں جو مردے کے پھولوں پر تعمیر کرائی جاتی ہے، الغرض یہ سب وہ چیزیں پیش کی گئیں جو مسلمانوں کے مذہبی یا نیم مذہبی معاملات سے متعلق ہیں اور تلاش سے اور بھی بہت گنوائی جاسکتی ہیں کلچر کے ذکر میں یہ نکتہ سامنے آجانا اہم ہے کہ ایک قوم کے کلچر میں قدیم قوموں اور بعید ملکوں کے کلچر کی شکلیں بھی ضرور ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے یہاں مردے کے ساتھ توشے کی رسم اس وتر تک ہے کہ ہم تعزیتے کے ساتھ بھی توشہ دفن کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ پانچہزار سال پرانی رسم ہے اور قدیم مصریوں میں اس رسم کا وجود ملتا ہے ان کا عقیدہ تھا کہ یوم حساب کو جب مردے اُٹھیں گے تو انھیں بھوک لگے گی۔

ایک تاریخی حقیقت یہ سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کی موسیقی ایک ہے اور یہ موسیقی مسلمانوں سے پہلے دھرم اور الپ تک محدود تھی اور عبادت کا ذریعہ تھی۔ مسلمانوں نے اسے سوسائٹی کی چیز بنایا اس میں خیال، پٹہ، ٹھمری وغیرہ کا اضافہ کیا اور ہر زمانے میں مسلمانوں نے بڑے بڑے باکمال پیدا کئے ہیں۔ مسلمان اسی موسیقی کو صدیوں سے سنتے چلے آ رہے ہیں اور آج بھی (میں ان مسلمانوں کو نہیں گستاخو جاؤں گی کہ برہمنوں کے لگتے ہیں) جدا کلچر کے مدعی بھی اُسی موسیقی سے انبساط حاصل کرتے ہوئے

سردھنتے ہیں۔ لہذا موسیقی کو اگر کلچر سے کوئی تعلق ہے اور اگر موسیقی کلچر کا کوئی جزو ہو سکتی ہے تو جدا کلچر کے معنی اس کا کیا جواب رکھتے ہیں کہ ان کے اندر اس موسیقی کا پیدا کردہ جو کلچر ہے اسے کیونکر باطل قرار دیا جائے گا یا کس طرح نکال پھینکا جائے گا؟ ایک موسیقی کے ہوتے ہوئے دنیا کا کوئی ذیہوش انسان تسلیم نہیں کر سکتا کہ ہندوستان کے ہندو مسلم کا کلچر جدا ہے۔

ایک دوسری تاریخی حقیقت یہ ہے کہ امیر تیمور کے پاس ہندوستان کے مسلم بادشاہوں پر حملہ کرنے کا شرعی حیلہ نکال ہندوؤں سے ماٹل ہو جانا ہی تھا اور تیمور کے زید و تقدس مذہبی کو گوارا نہ تھا کہ مسلمان ہندوؤں میں طرح کھپ بجائیں جس طرح وہ اس وقت شیر و شکر ہو گئے تھے آج بھی جب جداگانہ کلچر کا اس قدر غوغا ہے انہیں ”جدا کلچر“ کے مدعیوں کی بیگیاں اسٹھ کی بندیا لگا کر ان کو جھوٹا ثابت کر رہی ہیں اور اگر ان حضرات کے گھر میں ”کفر“ کی یہ تقلید اتفاقاً نہیں ہوتی تو گورنروں اور وائسرائے کی ہر پارٹی میں مسلم خواتین کے ماتھوں پر یہ سرخ ٹیکا دیکھا جاسکتا ہے۔

بعض نفس طبع حضرات اُردو سنسکرت کے بعض ثقیل و نامانوس الفاظ سے چڑھ جاتے ہیں اور جو اپنی سنجیدگی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں وہ شکر خند فرما کر جی خوش کر لیتے ہیں۔ میں ثقیل و ناموس الفاظ کا حمایتی نہیں، لیکن یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ ان بزرگوں کو علمی اور عملی طور سے اس معاملے کو سمجھنے کی فرصت نہیں ملتی۔ ورنہ وہ دیکھ لیتے کہ ثقالت کا مدار الفاظ کی اجنبیت پر ہے اور مانوس ہو جانے کے بعد ثقالت از خود باقی نہیں رہتی۔ روزانہ یہ حضرات سیکڑوں الفاظ ایسے بولتے ہیں جو نہایت ثقیل ہیں مگر ان میں ان کو ثقالت دکھائی نہیں دیتی۔ چند الفاظ پیش کرتا ہوں جن کا کوئی صحیح مترادف بھی نہیں۔ رگڑ، گھٹا ٹپ، نٹ کھٹ، جھٹ پٹا، الٹ پلٹ وغیرہ۔ یہ الفاظ ان لفظوں سے کم ثقیل نہیں جن کو آج ثبوت میں لایا جا رہا ہے۔ فرق صرف مانوس و ناموس ہونے کا ہے۔

الفاظ کی ثقالت کے باب میں لسانیات کا یہ مسئلہ ان بزرگوں کے سامنے نہیں کہ تحریری لفظ صرف ایک علامت و صوتی لفظ کی لیکن شہور ماہر لسانیات سر پچر ڈیجیٹ کا قول ہے کہ اصل لفظ صوتی لفظ بھی نہیں آواز بھی اصل لفظ کی اشارت و علامت ہے اس لئے کہ اصل لفظ تو وہ حرکات ہیں جو ہمارے اعضاء لفظ یا مخارج صادر کرتے ہیں اور ان مخارج کے حرکت کرتے وقت ہمارے سانس لینے کا نتیجہ آواز ہے۔ مگر چونکہ ہمارے یہ نظر آنے والے حرکات و اشارات اپنے ثانوی وصف یعنی آواز کے ذریعے سے ایصال یعنی (Communicate) ہوتے ہیں اس لئے آواز کو ان حرکات کی علامت (Symbol) قرار دے لیا گیا ہے۔

اس اصول کے تحت جب دیکھا جاتا ہے کہ ہماری زبان ہی ایسی خصوصیت کی مالک ہے کہ اسمیں انسانی حلق سے نکلنے والی ہر آواز کے لئے حرف موجود ہے، اور ہمارے گلے کی ساخت ہر لفظ کو ادا کر سکتی ہے تو پھر ثقالت پرناک بھول چڑھانا فطرت کا منہ چڑھانا معلوم ہوتا ہے۔ الفاظ کی ثقالت پسندیدہ شے نہیں لیکن فطرت نے ہمارے گلے کی اگر ہناوٹ ایسی رکھی ہے تو اس سے شرمناک کونسی عقلمندی ہے؟ بلکہ اس خصوصیت سے کام نہ لینا کفرانِ نعمت کہا جاسکتا ہے۔ بہر حال ضرورت کے وقت یہی بزرگ

اس بات کو خیر بھی بیان کرتے ہیں جو میری ناچیز رائے میں بالکل بجا و درست ہے۔ اس ضمن میں ”چھپرکھٹ“ کا لفظ یاد دلانا کافی ہوگا۔ یہ مرکب لفظ ہے اور چھپر اور کھاٹ، دو لفظوں سے بنا ہے۔ اس کے اندر اجزائے ثقل بھی ہیں لیکن اسکے مفہوم میں جو نزاکت و راحت، عشرت و تمول کے معنی پائے جاتے ہیں مفہوم ادا کرنے کے لئے دوسرا لفظ تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ کسی زبان میں ایک لفظ کے متعدد معنی اور ایک مفہوم کے لئے متعدد الفاظ ہونا ہی اُس زبان کے قول کی نشانی ہے اور اس حقیقت پر ہمارے شعراء بہتر اظہار خیال کر سکتے ہیں کہ بعض وقت کسی لفظ کا ایک رکن کم یا زیادہ ہونا کس ذہنی تکلیف کا باعث ہوتا ہے۔ اور بالآخر یا تو خیال ناقص طور پر ادا ہوتا ہے یا اس کا خون ہی کر دینا پڑتا ہے، اور اس صورت میں خود شاعر کا دل خون ہو جاتا ہے۔ لہذا یہ بات زبان کی ضرورت میں داخل ہے کہ اس کے اندر ہم معنی اور قریب المفہوم الفاظ کی کثرت ہو۔ ہمارے موجودہ ذخیرے میں ایسے مترادفات ہیں اور ان سے خاطر خواہ نفع بھی پہنچتا ہے۔ شجر اور درخت کے ہوتے ہوئے پیر کا لفظ بھی ہے۔ بدرود کے ساتھ موری اور نامی کے الفاظ بھی ہیں، جو کبھی ہماری زحمت کا موجب نہیں ہوتے بھرا اگر مضمون یا موضوع کے لئے ہمتے، وطن کے لئے جنم بھوم، ملک کے لئے راشٹر، بھی ہوں تو عقلاً کسی قباحت کا امکان نظر نہیں آتا۔

ضرورت اور غیر ضروری کی دلیل بڑے شد و مد کے ساتھ پیش کی جاتی ہے۔ مگر اپنی زبان کے یہ نادان دوست غور سے کام لینا پسند ہی نہیں کرتے۔ انگریزی میں (Wood or Forest) کے لفظ موجود تھے مگر آج نہیں بلکہ اس وقت جب ہندوستانی کالا آدمی اور اس کی زبان غلاموں کی زبان سمجھی جاتی تھی، انگریزی میں ”جنگل“ کا لفظ لیا گیا اور کسی انگریز نے اعتراض نہیں کیا کہ بلا ضرورت ”ٹیٹو“ لفظ کیوں لیا گیا ہے۔ چینی زبان میں ایک لفظ ہے ”کاؤٹاؤ“ اور اُس کا مفہوم وہی ہے جو ہمارے ”جی حضور پوں“ کا فعل ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے بہت اسلوب ہو سکتے تھے، لیکن یہ لفظ بھی لے لیا گیا اور کوئی مترض نہ ہوا کہ یہ ٹیٹو ہا بانکا تلفظ ہم سے ادا نہیں کیا جاسکتا۔ پرانے ادب پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں اور ہر شخص معمولی توجہ سے دیکھ سکتا ہے کہ زبان کے اندر رد و قبول کا فطری عمل ہوتا رہتا ہے اور اسے اپنے اس عمل کے لئے ہمارے کسی اکسانے یا ہماری کوشش کی ضرورت مطلق نہیں ہوتی۔ جہانگیر کو الفاظ میں اصلاح و تصوف کرنے یا نئے لفظ گھڑنے کا شوق تھا۔ اُس نے بہت سے لفظ بنائے۔ چہار شنبہ کو کم شنبہ اور پنج شنبہ کو مبارک شنبہ کہا مگر کسی نے نہ مانا۔ نور جہاں نے ایک خاص قسم کی چوڑیاں وضع کیں، ان کا نام جہانگیری رکھا آج تک جہانگیریاں کہلاتی ہیں۔ پچھلے چند سالوں میں ہم نے کچھ انگریزی الفاظ کے ترجمے کئے، اکثر نام مقبول ہوئے۔ موسائی کے لئے ہم نے ہیئت اجتماعیہ جاری کرنا چاہا، معاشرہ تجویز کیا، مگر مخصوص تحریروں سے باہر کسی کی زبان پر نہ چڑھے اور ہم نے مطلق کوشش نہیں کی مگر اسی معنی میں سماج کا لفظ چند روز کے اندر عام ہو گیا۔ گارڈن پارٹی کو برک و مہم بھتا ہے مگر عمر کا لفظ ان دعوتی کارڈوں ہی پر چھپا ہوا ملے گا۔ پبلک کے مفہوم میں ہم نے جمہور کو رواج دینا چاہا، اخباری صفحوں

مٹے باہر نہ جاسکا، پبلک نے اسے پبلک ہی کہا اور اب جتنا کو بھی پسند کیا جا رہا ہے۔ ڈیا کرسی کے مشہور میں جمہوریت ہر وہ آدمی سمجھتا ہے جو پبلک جلسوں میں شریک ہوتا ہے۔ اب شاید اس کی جگہ جتنا راج کو مل جائے۔ لائیو ٹیلی ویژن کے لکھنوں کی زبان سے بھی مشعل ادا ہوتا ہے لیکن پروگرام کا لفظ ہر شخص بولتا اور سمجھتا ہے۔ ایسٹ انڈیا ریوے نے ایک گاڑی چلائی کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کا نام طوفان میل کس نے رکھا، مگر ہندوستان کے کونے کونے میں یہ نام پھیل گیا۔ اسی نام کا ایک فلم بھی بن گیا عوام کے اندر ضرورت ہونے ہو، پٹینٹ، یعنی قطعی، فیور، یعنی طرفدار، پٹینٹ، یعنی جلد داری، عام طور سے بولے اور سمجھے جاتے ہیں اور بھی کچھ الفاظ حال میں داخل ہو گئے اور زبان نے ان کو اپنا لیا ہے۔ مثلاً شادی، سنگٹھن، نیتا، سامراج وغیرہ غرض زبان مسلمہ طور پر ایک عنفوان بجات یا جاندار چیز ہے۔ وہ ہر اس غذا کو الٹ دیتی ہے جو اسے نامرغوب ہو اور ہر اس لقیل اور بادی چیز کو بھی ہضم کر کے خون جگر بنا لیتی جسے اس کی طبیعت قبول کر لے۔ دوسری طرف کچھ پراچینی تہن ہیں جو زبانوں کے بننے، بدلنے اور بگڑ جانے کے اصول سے بالکل بے خبر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ عام طور سے چالو اور سمجھے جانے والے بگ اور بلکے لفظوں کو چھوڑ کر موٹے موٹے الفاظ ٹھونس رہے اور ایک نئی بھاشا بنالینے کی دھن میں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں بھول نے جو فائدہ سوچا ہے وہ حاصل ہو جائے، لیکن متحدہ قومیت جس کا وہ پرچار کر رہے ہیں ہرگز نہیں بنا سکتے۔ مصنوعی طور پر کچھ الفاظ لیکھوں اور بھاشنوں میں استعمال کئے تو جا سکتے ہیں جن کا چند روز بعد مرجانا ہی ممکن ہے۔ لیکن چل جانے کی صورت میں بھی کوئی بڑا کارنامہ نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس لئے کہ اس کی جو قیمت دی جا رہی ہے وہ بہت زیادہ ہے۔ ایک تو خود ان مہاشنوں کا مطلب پورا نہیں ہوتا یعنی ان الفاظ کو بہت سے لوگ نہیں سمجھتے۔ دوسرے اس بنا پر باہمی اختلافات بڑھ رہے ہیں جو قومی نقصان ہے۔ کچھ زبان کے اندر مقبول ہو جانے کی صورت میں بھی جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے سو وہ اسی فیصدی ہندی لفظ بولنے کے بعد بھی جو ہیں سو ہیں۔ جہاں تک یوپی کے ہندوؤں کا تعلق ہے تو یہ متعصبانہ طریق عمل ان کو ہندو بنا رہا ہے اور جہاں تک دوسرے صوبوں کے لئے راشٹر بھاشا کو آسان بنانے کا تعلق ہے، سو گجراتی، مراٹھی اور بنگالی میں پہلے سے عربی فارسی الفاظ کی کافی آمیزش ہے اور صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ مسلم عنصر زبان میں داخل ہونے سے اگر ہندوؤں کو کوئی نقصان متصور ہو سکتا ہے تو وہ نقصان تو پہونچ چکا اور سنسکرت یا ہندی بڑھادینے سے اگر مسلمانوں کا کوئی نقصان متصور ہو سکتا ہے تو وہ بھی پہونچ چکا۔ تلاش اس کی ہونا چاہئے کہ آخر وہ نقصان تھا کیا؟

ان سببوں کے سامنے یہ بات بھی ہونا چاہئے کہ فارسی تو سنسکرت کی مال جانی ہے، فارسی سے نقصان کہلاتا تو پرانی چھینک پر اپنی ناک کٹا نا ہوگا۔ فارسی اردو تو آریائی نسل کی زبانیں ہیں۔ اب رہ جاتی ہیں ڈر ویدی زبانیں سو انکو سنسکرت سے قریب لے آنا لغو دلیل ہے۔

”ہماری تمھاری زبان“ کے قفقے میں اگر یورپ کی اس مثال کو سامنے رکھا جائے تو شاید ایک مفید بات ثابت ہو۔ یورپ کے بین الاقوامی معاملات میں ایک مدت سے اور بالکل فطری طریق پر ذرا لٹوی زبان استعمال ہوتی چلی آرہی ہے۔

جنگ عظیم کے بعد اس کی جگہ انگریزی لے رہی ہے۔ اس پر نہ تو فرانسیسیوں نے داویلا کی اور نہ انگریزوں نے کوشش کی تھی ہمارے ان پراچینی سمجھوں نے اس پر بھی دھیان نہیں دیا کہ سنسکرت صحیح معنی میں کسی وقت بھی عوام کی بول چال نہ بن سکی اور وہ اس تاریخی حقیقت سے بھی آنکھیں چرا رہے ہیں کہ عوام کی ضرورت نے جب پالی کو رائج کر کے سنسکرت کو بارہ پتھر باہر کر دیا تھا، اس زمانے کو بیتے ہوئے ڈھائی ہزار برس ہو چکے ہیں اور مڑ کر دیکھنا سمجھ کا سمجھاؤ نہیں، انسانی ارتقا ایک منزل سے دو دفعہ نہیں گزرتا ہمارے یہ بھائی دنیا کے سامنے اپنے آپ کو سپا بھڑانے میں ممکن ہے کہ کامیاب ہو بھی جائیں کیونکہ یہ زمانہ ہی پروگنڈے کا ہے، لیکن وہ خود اپنے ساتھ سچے نہیں ہیں۔ آج بھی وہ اپنے بیوی بچوں سے جس زبان میں بات چیت کرتے ہیں وہ، وہ نہیں ہوتی جس میں وہ اپنے لیکھ لکھتے اور دیکھا دیتے ہیں۔ انھیں وچار نہیں کہ ان کے لیکھ اور دیکھا جنتا کو متاثر نہیں کرتے کیونکہ جنتا ان کو سمجھتی نہیں ہے۔

علم زبان کے ماہروں کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ الفاظ قوسلی شاعری، قوسلی اخلاقیات اور قوسلی تاریخ ہیں۔ قوسل ایک علمی اصطلاح اور بین الاقوامی لفظ ہے اور اس کا مفہوم ان ابتدائی آثار حیات سے ہے، جو زمین کے پیٹ میں سے نکالے جاتے ہیں۔ اب انگریز صحیح ہے کہ یہ پراچینی بھائی ہندوستان میں مسلمانوں کی ہریادگار کو مٹانے پر تل گئے ہیں تو ان بھائیوں کو پھر ایک دفعہ وچار کر لینا چاہئے کہ ان کا یہ خیال کہاں تک مستحسن، کس حد تک ممکن اور کس طرح قابل عمل ہو سکتا ہے۔ زبان کے بارے میں تو ان کی یہ کوشش غیر فطری ہے اس لئے ناکام رہنے والی ہے، لیکن اگر بحث کی خاطر مان لیا جائے کہ کامیاب بھی ہو جائے گی تو کیا ان بھائیوں کے سامنے یہ حقیقت نہیں آتی کہ وہ خود اپنی کئی صدیوں کی تاریخ معاشرت کے خزانے اپنے ہاتھوں غارت کر بیٹھیں گے؟ کیا اس طرح وہ مسلمانوں کے ساتھ اپنی رواداری اور بھائی چارے کی زندہ شہادتوں کو فنا نہ کر دیں گے؟ یہ مہاشے اس عظیم حقیقت کو نہیں دیکھ رہے کہ تین ہزار برس پرانا زمانہ زندہ نہیں کیا جاسکتا، اور اگر وہ ایسا اچرج دکھا بھی سکے تو آج کی دنیا کے نقشے میں اسے کیسے بٹھائیں گے؟ یا پنڈت جو اہرلال کے لفظوں میں (Fit in) کیسے کریں گے۔ یہ سچن ایک اور سچی بات سے بھی موٹھ چھپا رہے ہیں اور وہ یہ ہے کہ زبان اور کلچر کی محافظ اور رکھوالی عورت ہے۔ اور آج ہندوستان کی عورت نئی سڑک پر چل پڑی ہے۔ پچھلے پچاس برس میں یہ بھائی سنسکرت اور پراچینی سمجھتا کا پرچار کرنے کے بعد کیا پھل پاسکے؟ ہندو گھروں اور ہندو عورتوں کی بدلتی ہوئی حالت تو نئی روشنی کی طرف لے جا رہی ہے۔ یہ بھائی اگر آج کی حالت پر سے آئندہ وقت کا اندازہ لگا سکیں تو اپنی عورتوں کو دیکھ کر اس کا برتا ہوا تصور انھیں اپنی کوشش سے بات اٹھالینے پر مجبور کر دے گا، اور اگر گزرے زمانے کے حالات پر آئندہ زمانے کے بارے میں قیاس قائم کر سکتے ہیں تو سوشلزم یا سماج داد تحریک کو نیشنل کانگریس کی پچھلے پچیس برس کی تاریخ کی روشنی میں دیکھنے سے اجاگر ہو جائے گا کہ دیش میں آگے چل کر سماج داد کے وچار پھیلیں گے اور سماج داد ”پراچینی پاگل پن“ کو ایک منٹ کے لئے نہیں سہار سکتا اور اس کی ایک وجہ ہے۔ وہ وجہ یہ ہے کہ

سلج داد کی تحریک عالمگیر تحریک ہے، غریب مزدور اور کسان کی تحریک ہے۔ ان بھائیوں نے اس بات کو بھی نہیں دیکھا کہ یہ یوپی میں میٹھک جو ملک کو تین ہزار برس پیچھے لیجا نا چاہتے ہیں تو ان کے ساتھ پنجاب جائے گا کہ مدر اسس؟ مہی جائے گا کہ بنگال؟ یوپی میں سے آخر یہ سارے ہندؤں کو ساتھ لیجا سکیں گے؟ کشمیریوں اور کالیستھوں یا کسانوں اور مزدوروں کو ساتھ لے لیں گے، جبکہ کسان اور مزدور اپنے حق کو سمجھنے اور مانگنے لگ گیا ہے؟ پراچین زمانے میں تو ان غریبوں کی مانگ تو رہی درکنار اپنے جینے کا بھی حق معلوم نہ تھا۔ یہ بھائی خود نہیں سمجھے ہیں کہ ٹیلیفون اور ٹائپ رائٹر، ریل اور موٹر، ریڈیو اور ہوائی جہاز کے لئے پراچین زمانے میں جگہ کیسے نکلے گی؟ تعلیم کا انتظام بدلا جائے گا ہے، انڈسٹری پلاننگ ہو رہا ہے اور تین ہزار برس پرانا زمانہ زندہ کیا جا رہا ہے، اسی کو دنیا طرفہ تماشا کہتی ہے۔ الغرض، اگر ملک کی تاریخ میں ہزار آٹھ سو سال کا زمانہ سادہ اور خالی رکھنے کی ٹھان لی گئی ہے تو دنیا اس کو پاگل پن کے سوا دوسرا نام نہ دے گی۔ میں جتنا غور کرتا ہوں مجھے تو یہ دھن اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی کہ کوئی آدمی سر کو پہاڑ سے ٹکرانے لگے۔ صرف ایک زبان کا مسئلہ اتنا بڑا ہمالیہ ہے جسے اٹھانا تو بڑی بات ہے چکایا نہیں جاسکتا۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک مال کا قانون ایک ہی سا ہے اور مسلم عہد کی یادگار ہے اس کی اصلاحیں مسلم زمانہ ہی سے جاری ہیں اور جس طرح درخت جڑ پکڑ لیتا ہر زراعت پیشہ ہندوستان کے اندر جڑ پکڑ چکی ہیں۔ پھر ضابطہ فوجداری اور عدالت دیوانی کی تمام اصطلاحیں دیہات کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ دکھنی ہندوستان میں نہیں بلکہ مدر اس علاقے میں میراث دار وغیرہ قسم کے الفاظ رائج ہیں۔ بنگلہ میں آئین اور آدم شماری قسم کے ہزاروں الفاظ شامل ہیں۔ کہاں تک چھانٹے جائیں گے؟ اور ان کے قائم مقام لفظ آئیں گے کہاں سے؟ گجراتی، مرہٹی اور بنگلہ سے اگر عربی فارسی چھانٹ دی جائے تو بولیاں رہ جائیں گی۔

ان بھائیوں نے خود ہندی کی پوری جانچ نہیں کی ورنہ ان کو دکھائی دیتا کہ عربی فارسی کے بہت سے لفظ ہیں جن کے ہم معنی لفظ اگر ہندی میں تھے تو اب ناپید ہیں۔ ان کو نکال کر سنسکرت کے الفاظ رائج کر دینا ممکن نہیں ہو سکتا۔ یوپی کے شہروں میں ایسے بہت سے لفظ رائج ہیں۔ برات کی رخصت کو بدلا کہا جاتا ہے، زچہ اور بچہ کے لئے ہندی لفظ نہیں ہے۔ جہیز یا دہیزر گاؤں گاؤں میں بولا جاتا ہے۔ کانگریس کی تحریک سے پہلے چرخہ کل ہندی لفظ تھا منگنی کے وقت جہیز ٹھیلانے کو کرار داد کہا جاتا ہے۔ دولہا نوشہ اور اس کے ساتھ شہ دالاعام طور سے برے جاتے ہیں۔ دولہا جامہ ہی پہنتا ہے۔ شربت نوشی کی رسم کثرت سے ادا ہوتی ہے۔ پنجاب کے ہندؤں میں ”پلنگ اور چرخہ“ جہیز کی خاص چیز ہیں برت کھولنے کے لئے برنی، قلاقند، خرم، بالوشاہی، مٹلاب جامن، اور علواہی کھایا جاتا ہے۔

میری سمجھ کام نہیں کرتی کہ مٹھائیوں کے نام بدیسی ہیں مگر انھیں بدلا کیسے جائے گا اور کیا یہ بھائی ان تمام پھلوں کا کھانا پھوڑ دیں گے جو مسلمانوں کے ساتھ آئے؟ سیب، سرودہ، خربوزہ، خودبانی، کشمش، بادام وغیرہ اپنے ناموں سے

فارسی مونا بنار ہے ہیں۔ کیا وہ گلاب کا سو گھنٹا چھوڑ دیں گے۔ لحاظ اور رضائی کا دوسرا نام کیا رکھیں گے۔ سپہ ہوانی تو یقیناً کریں گے مگر خم ٹھونکنے کے لئے کونسا لفظ ایجاد کریں گے۔ آج کل کے اصولِ صحت نے بھی پتلی کے برتنوں میں اندر کی طرف قلعی ضروری قرار دیدی ہے، کیا یہ بھائی اب قلعی نہ کرایا کریں گے؟ ہندوستانی سنگیت کو مسلمانوں نے جس بلندی پر پہنچا دیا کیا یہ بھائی اس پورے حصہ کو سنگیت و دیا سے خارج کر دیں گے؟ کیا خیال کا گانا چھوڑ دیں گے؟ اچھا مسلمانوں کی تہذیب کے جو افراد صدیوں سے ان کی سرشت بن گئے، خون کے ذریعے بن گئے ہیں، ان کو جدا کرنا کیونکر ممکن ہوگا؟

دیہاتیوں اور عوام کو سمجھانے کے لئے سنسکرت الفاظ کا استعمال بھی نامعقول دلیل ہے۔ گردن اور مکر کے لئے ہندی کا کونسا لفظ استعمال ہوگا۔ ان لفظوں کو ہر دیہاتی سمجھتا ہے اور مکر کے لفظ بھی سے اس نے ایک کپڑے کا نام مکرئی رکھ لیا جس کی نیچائی کمر تک ہوتی ہے۔ حسن اور حسین سندرتا اور سند کے لئے مغربی یونانی کے دیہاتی ملوک کا لفظ بولتے ہیں جو صورت کے اعتبار سے عربی ہے۔ اس قسم کی مثالیں گونا گونا قصد دہنیں ان سے تو کتابیں بھر جائیں گی۔ مقصد تو امر واقعہ کی طرف توجہ دلانا ہے۔

ان بھائیوں نے جس کام کا بیڑا اڑایا ہے، انہیں نہیں معلوم کہ وہ ان کے بس کا ہے بھی، رامین اور کبیر داس کے دو سہ اور بھجنوں کی کانٹ چھانٹ کر سکیں گے؟ پدمارت کو جلا دینے اور رحیم اور دوسرے مسلمان کو یوں کی کوتاؤں کو لگا لیں بہا دیے کے بعد ہندی سانبھ کی کیا صورت رہ جائے گی اور کیا اس جنوں میں دہلی کی مسجد اور آگرے کے تلج کی بنیادیا اکھاڑ پھیکیں گے؟ مسلمانوں کی نشانیاں ہیں؟

ان ہماشون نے اگر اپنا طریقہ نہ بدلا اور ٹکونسم ٹھانس جاری رکھی تو چند افعال کے سوا باقی زبان دوسری جماعت کی سمجھ سے باہر ہو جائے گی۔ پھر کیا ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے کے لئے انگریزی ہی رکھی جائے گی؟ لیکن جب آج بھی مسلم صوبے اور ہندو صوبے ہیں تو کیا پھر فیصدی پراچینی پچیس فیصدی حجازیوں کو سمجھنے سمجھانے پر مجبور نہ ہوں گے اور اس کے برعکس بھی؟

الحاصل میں ذاتی طور پر اسے نہیں مان سکتا کہ ہندو قومی اعتبار سے مسلمانوں کی ہر چیز نفرت کرتا ہے۔ کیونکہ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندو قومی تعصب کا انہماک انگریز سے نہیں کرتا، حالانکہ قصود مسلمان اور انگریز کا ایک ہی ہے۔ البتہ مسلمان کی ایک خاص خطا بھی ہے۔ یعنی اس نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا کر بھارت کو بھرتشٹ بھی کر دیا۔ اس کی سزا بے شک نفرت سے دیجا سکتی ہے اور نفرت ایک فطری جذبہ ہے۔ مگر اسے دیکھنا نہیں۔ لیکن میں بتانا چاہتا ہوں کہ دنیا ایسی نفرت کے متعلق بھی فیصلہ دے گی کہ وہ نفرت بھی تم کی نفرت ہے۔

ہاں تو چند سرسبز دل کا خیال یا عمل ساری قوم کے سر نہیں تھوپا جاسکتا اور وہ وقت قریب ہے جب ہندوؤں میں اعلیٰ دانش اور قوم پرست ہستیاں اس طرف توجہ کر سکیں گی۔ کیونکہ دیس میں اگر ایک آدمی بھی ایسے دھار رکھتا ہے تو وہ دیس کے لئے

کلنگ کا شیکا ہے۔

زبان کے بارے میں پھر یہی کہنا چاہتا ہوں کہ جو چیز غیر فطری ہے کبھی سرسبز ہوگی اس لئے جتنی وہ کوشش
احتمال ہے اتنا ہی اس سے ڈرنا بے معنی۔

اب حضرات اُردو ہوں یا پراچینی مہاشے، اس سے انکار نہ کر سکیں گے کہ زبان سے ادب اور ساتھ ہی وجود میں آتا ہے
اور ادب قومی زندگی کا آئینہ اور اُس زندگی کے سنوار سدھار کا ذریعہ ہے۔ دونوں کو اس سے بھی انکار نہ ہوگا کہ ہمارا ادب
اور ساتھ ہی تو نوے فیصدی ہندوستانیوں کی زندگی کا آئینہ ہے اور نہ اُس نے اس زندگی کے سنوار سدھار میں اپنا
فرض ادا کیا ہے۔ اور اس حقیقت سے بھی انکار نہ کیا جاسکے گا کہ دنیا ایک زبردست پھل میں مبتلا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ
ایک بہت بھاری انقلاب ہے جو تیزی سے ہمارے قریب ہوتا جا رہا ہے۔

ان واقعات کو دیکھنے کے لئے نہ تو دور بین کی ضرورت ہے اور نہ خوردبین کی۔ جنگ عظیم کے بعد سے عوام کی تحریکیں
زور پکڑتی جا رہی ہیں، طبقہ اتنی تنظیم بہت گرے ہوئے ملکوں میں بھی شروع ہے اور یہ وہ خواب نہیں جس کی مختلف تعبیریں ہو سکتی
ہوں۔ ہم اگر اپنے ذہن و خیال کے پٹ بند بھی کر لیں تو آنے والے طوفان کی تیز تند ہوائیں ان کی چولیں بلا ڈالیں گی اور ہمیں سمجھنا
پڑے گا کہ انسانیت کے مظلوم طبقوں کی بیداری جو دنیا میں نوے پچانوے فیصدی ہے ایک حقیقت ہے اور دنیا میں جتنا ہی
کاراج ہوگا۔ اس وقت عوام کی زبانیں پھیلنے لگیں، جذبات اپنی تہذیب اور سمجھتا خود بنائے گی۔ اس لئے چاہے وہ اُردو کا ادب ہو
یا ہندی کا ساتھ اپنی بقا کے لئے ان کو چولا بدلنا ہی پڑے گا۔ اُردو میں ایسے بے شمار اسلوب در آئیں گے جن کو عوام سمجھتے ہوئے
ہندی سے وہ شدید نکال پھینکے جائیں گے جن کو جتنا سمجھتی نہ ہوگی۔

زبان کی موجودہ حقیقت اسل میں زبان اور کلچر کی نزاع نہیں بلکہ مفاد اور اغراض کی چالاکیاں ہیں۔ مصلحتوں اور قابو پاتے
طبقے، ہندو اور مسلمان دونوں اپنی اغراض اور اپنے تفوق کو برقرار رکھنے کے لئے چالیں چل رہے ہیں۔ لیکن زبان اور کلچر
کے بارے میں صرف فطری قانون کام کریں گے اور اُس فطری قوت کے سامنے نہ شیخ صاحب کی ضد مستلیم رہنے لگی نہ
مہاشے جی کی نفرت۔

فلسفہ زبان کے ماہر یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہم جو کچھ بولتے ہیں وہ ہمارا بطون یعنی ہماری دہپا آتا ہوتی ہے اور ہم الفاظ کے
ذریعے سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ ہمارے خیال، ہمارے عندے، ہمارے احساس، ہمارے ارادے، اور ہماری خواہشیں
الفاظ ہی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں اور الفاظ ہی کے اندر چھپی رہتی ہیں۔ الفاظ اور ان کی ترتیب پر قادر ہو کر ہم اپنی
دلی باتوں کو موثر طریقے سے ظاہر کر سکتے ہیں اور دوسروں کے الفاظ میں چھپے ہوئے معنی کو سمجھ لیتے ہیں، اور یہ قدرت
ہمارے اندر ہی ہے۔ الفاظ کے ذریعے سے ہم ہر چیز اور ہر بات کی جانچ کرنے کے قابل ہوتے ہیں اور اُس جانچ کا جو
نتیجہ ہوتا ہے اس کے اسباب و علل کا طویل سلسلہ ایک پل بھر کے اندر ہمارے خیال میں طے ہو جاتا ہے اور ہم نہیں سمجھتے

کہ یہ کس طرح ہو گیا۔

اس حقیقت کے ہوتے ہوئے اس چیز سے کام لینا انسانیت کا تقاضا ہے، پاسکل کے بقول، جس نے ہمیں اشرف بنا دیا ہے اور وہ چیز ہمارا تفکر اور وچار ہے۔ انسانوں کی وہ دو جماعتیں جو ایک ہی خاک پاک سے بنی ہوں، ایک ہی زبان صدیوں سے بولتی آرہی ہوں، جن کے سوچنے کا طریقہ ایک ہو، وہ ادنیٰ و حقیر باتوں کے فرق کو قومیت اور کلچر کا اختلاف قرار دیں اور اسی پر باہم دست و گریباں ہو جائیں، ہوش و خرد کی بات تو نہ کہی جائے گی، دونوں جماعتوں کو عقل و خرد سے کام لینا ہی پڑے گا کوئی جماعت عقل کو طلاق دیکر زیادہ مدت نہیں جی سکتی

ہندوستان کے اندر مسلمانوں کا وجود ہے اور صدیوں سے ہے اور مسلمان ہندوستان کا قومی سرمایہ ہیں نیز آٹھ نوکرور کی تعداد اتنی چھوٹی تعداد نہیں جس کا مٹانا آسان ہو یا جس کو کہیں منتقل کر دینا ممکن، اور یہ بھی محال ہے کہ ملک کی ایک چوتھائی آبادی نظر انداز کی جاسکے۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت کہ نام کے ساتھ یا بے نسبتی کا دم چھلا آج کل فیشن ہے، لیکن واقعاً دیکھئے تو اصل یائے نسبتی ایک ہی ہے اور وہ ہندی کی یا بے نسبتی ہے۔ عرب سے آنے والے بہت قلیل تھے۔ وہ عورتیں ساتھ نہیں لائے تھے۔ لہذا اُس محدود یائے نسبتی میں کھوٹ تو یہیں سے ثابت ہو گیا۔ اب وہ مسلمان جو ہندوستان ہی کے رہنے والے ہیں، انھیں کی یا بے نسبتی یعنی ”ہندی“ کھری قرار پاتی ہے اور اُسی کی اکثریت بھی ہے یعنی مسلمانوں کا سواد اعظم ہندی ہے۔

چنانچہ محض عقیدے کی بناء پر اپنی قومیت جدا بنانا اور جدا کلچر کا دعوت کرنا لاطائل بحث ہے اور محض عقیدے کی بناء پر اپنے ہی گوشت و خون کو غیر سمجھنا اپنے اعضاء کو کاٹ پھینکنے کی حماقت کے سوا دوسرا نام نہیں پاسکتا۔ جن انسانوں کا ملک و وطن ایک ہو، عادت و خصلت ایک ہوں، خیال و احساس کا طریقہ ایک ہو، خون و گوشت ایک مٹی سے بنے ہوں، غرض ہر لحاظ سے وہ معمولی و سطحی جماعتی فرق و اختلاف کے علاوہ ایک ہیں اور ایک قوم ہیں۔ جتنی کچھ غیریت تھی وہ خون کی آمیزش اور ہندوستان کی طویل و طینت سے صدیاں ہوئیں کہ غائب ہو چکی ہے اور جن باتوں کا فرق گنایا جاتا ہے وہ فرق تو ایک صوبہ کے ہندو اور دوسرے صوبہ کے ہندو میں، ایک صوبہ کے مسلمان اور دوسرے صوبہ کے مسلمان میں ہی نہیں بلکہ ایک شہر کے اور ایک گھر کے دو ہندوؤں یا دو مسلمانوں میں ملے گا۔ اس فرق و امتیاز کو جدا کلچر اور جدا قومیت کی وجہ قرار دینا عقل کی کسوٹی پر پوری نہیں اُترتی۔ اور یہ حقیقت جس قدر جلد محسوس کر لی جائے قوم و وطن کے لئے اتنا ہی زیادہ بہتر ہوگا۔

علمائے زبان کا ایک اور فتوے بھی ہے جس کو سمجھ لینے کے بعد الفاظ کی در آمد سے ڈرنا بے معنی معلوم ہوگا۔ الفاظ کے طبقے اور گروہ ہوتے ہیں، اُن کے خاندان اور شجرے ہیں، ان میں امتلات اور ہم جنسی ہوتی ہے، ان میں شریف اور ذلیل ہوتے ہیں اور ان میں سبکدوش کے اثر سے اچھے بُرے ہو جاتے ہیں اور بُرے اچھے۔ چنانچہ جو لوگ زبان کے فلسفے سے واقف نہیں لیکن الفاظ کا استعمال کرنا جانتے ہیں وہ بھی بتا سکیں گے کہ ایک ہی مفہوم کے متعدد لفظ سامنے ہونے پر بھی ایک

مناسب لفظ کی تلاش کا کاٹا ٹھکانا رہتا ہے اور کسی وقت ایک مفہوم کے لئے مناسب اور صحیح لفظ ذہن میں بجلی کی طرح آجاتا ہے تو ایک نیا تصور، نیا خیال، عبارت میں نیا زور پیدا کر دیتا ہے اور ایسا لفظ سوچہ جانا وہ الہام ہے جو سننے یا پڑھنے والے کے ذہن و فہم میں ایک ایسے تار کو چھیر دیتا ہے کہ وہ بھی مصنف کے ساتھ ہم صفر ہو جاتا ہے۔

آج تک کوئی مصنف اپنی زبان کے تمام الفاظ استعمال نہیں کر سکا۔ ایک مصنف انہیں الفاظ کو استعمال کرتا ہے جسکی روح معانی سے وہ آشنا ہو چکا ہے اور جن الفاظ کو ایک مصنف استعمال نہیں کرتا ان کو دوسرا کمال خوبی اور زور بیان کے ساتھ استعمال کرتا ہے۔ پھر ایک ہی مصنف مختلف موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے اور ارسطو کے قول کے مطابق زبان کا رتبہ موضوع کے رتبے کے مطابق ہونا چاہئے، یعنی ایک ہی مصنف ایک جگہ الفاظ کا ایک سیٹ استعمال کرتا ہے اور موضوع کی مناسبت سے دوسرے مضمون میں دوسرا سیٹ۔ پھر ایک ہی سیاق و عبارت میں ایک لفظ مختلف لوگوں کے سامنے مختلف تصورات پیش کر سکتا ہے اور لغت کے اندر لفظ کی جو حیثیت ہوتی ہے عبارت میں آکر بدل جاتی ہے۔ الفاظ نرم و نازک بھی ہوتے ہیں اور سخت و کڑھ بھی، مکرر و تلخ بھی ہوتے ہیں اور تکلیف دہ و خوش کن بھی، اور ان کی یہ مختلف حیثیتیں ان الفاظ (اسماء) کے ان تصورات کے مطابق ہوتی ہیں جو وہ ہمارے اندر پیدا کر دیتے ہیں۔

ان حقائق کو سمجھ لینے کے بعد مروجہ عربی فارسی الفاظ سے چڑھنا یا بعض نئے سنسکرت الفاظ کے داخلے پر ہر فروختہ ہونا ناممکن ہو جاتا ہے اور زبان کے مذہب میں تو یکسر ناروا ہے۔ الفاظ لغت کے اندر زیادہ سے زیادہ ہوں لیکن ان کا استعمال تو میرے آپ کے ذوق و انتخاب پر ہے اور وہ ایک فطری طریقہ ہے۔ بولتے وقت میں آپ کو سمجھاتا ہوں، اور سنتے وقت آپ مجھے یعنی میرے معبود ذہنی کو سمجھنے کی کوشش پر مجبور ہیں۔ آپ اگر نہیں سمجھ سکے تو میرا کہنا بیکار گیا۔

ہماری زبان جسے خواہ اردو کہئے یا ہندی، لیکن آئندہ وہ ہندوستانی کے نام سے جانی جائے گی اپنی ساخت اور بناوٹ کے اعتبار سے آریائی زبان ہے۔ تصریحات میں جائے بغیر میں اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ہماری زبان ضرورت انسانی کے تحت وجود میں آئی، فطری قاعدوں کے تحت پروان چڑھی۔ ہمارے آنے والی قوم کی ضرورت قوی تر تھی اس لئے ملک میں بسنے والی قوم کی زبان کے الفاظ زیادہ سیکھنا پڑے۔ مسلمان ہندوستان میں داخل ہوئے تو عربی، ترکی، فارسی بولتے ہوئے آئے ہوں گے، اور اپنے بدن کے اعضاء اور رشتہ داروں کے نام ساتھ لائے ہوئے گئے لیکن یہاں پہنچ کر انھوں نے خالص ہندی چیزوں ہی کے نام نہیں سیکھے بلکہ اپنے اعضاء کے ناموں کے بدلے بھی ہندی اسماء اختیار کر لئے۔ اعضاء جسمانی اور رشتوں کے نام دو چار کے سوا تمام ہندی ہیں۔

جہالت کے نتیجے میں ضد کر کے اگر کوئی قوم اپنی زبان کو محدود رکھنے میں با مراد ہو جائے تو اس کے لئے ٹرینج کا فیصلہ یہ ہے کہ کسی انسانی گروہ کے وحشی و نامہذب ہونے کا اٹل ثبوت اس قوم کی زبان کا افلاس ہے اور اُسے پستی میں ڈالے رکھنے والی چیز بھی اس کی زبان کی ہے مگر کسی انسان کو اتنا ہی علم کرایا جاسکتا ہے جتنا ان لفظوں کے

اند رہے جنہیں وہ سمجھتا ہے۔ یعنی زبان کا سرمایہ الفاظ بڑھے بغیر کوئی قوم ادبار کے گڑھے سے ابھر نہیں سکتی۔ یہی بات اس نظریے کی بنیاد بن گئی کہ جس طرح زبان خیال کے لئے غذا، ہم پہنچاتی ہے اُسی طرح اس کو محدود بھی رکھتی ہے۔ مسئلے کی علمی و منطقی صورت اگر یہ ہے جو آپ نے دیکھی تو پھر ضرورت و غیر ضرورت کی غیر منطقی دلیل لا کر زبان میں الفاظ کے داخلے پر سنسربٹھانا صرف زبان کے ساتھ دشمنی نہیں بلکہ اخلاقی خودکشی بھی ہے۔

جو لوگ منطقی طور پر سوچنے کے عادی ہیں وہ سبب و علت پر غور کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ زبان کی موجود حجت و بحث میں یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ آخر کیا اسباب ہو سکتے ہیں جو صدیوں سے ایک زبان بولتے بولتے ایک جماعت اس زبان سے بیزار ہو جائے جو باہمی رواداری اور قومی ہم رنگی کی ایک جیتی جاگتی مثال ہو، جسے دو بڑی جماعتوں کی متحدہ اور متفقہ کوششوں نے پروان چڑھایا ہو۔

اس طرح پر غور کرنے سے سیاسی اسباب سب سے پہلے سامنے آتے ہیں اور غیر ملکی حکومت کے لئے شہرے کے واقعہ کی تکرار کو روکنے اور اپنا استحصال برقرار اور جاری رکھنے کا آسان اور یقینی نسخہ یہی تھا کہ باہم چھوٹ ڈال دیجائے۔ یہ پالیسی کسٹھ کامیاب ہوئی اس پر روشنی ڈالنا تحصیل حاصل ہے۔ سرکاری نوکری کی آپارٹھاپی سے صدیوں کے جڑے دل پھٹتے گئے اور الیکشن کے ساتھ جداگانہ انتخاب نے اس چھوٹ کو پکا کر دیا۔ زبان کا شاخسانہ بھی حکومت کا کھڑا کیا ہوا ہے، جس کی بنیاد ڈالنے کا کام سرایٹولی میکڈانل نے انجام دیا تھا۔ اختلاف کی اصل جڑ تو یہ تھی۔ لیکن قریبی اسباب میری ناچیز عقل کے مطابق یہ ہے کہ مسلمان اپنی حکومت کے زمانے میں احساس برتری بنکر رہ گیا تھا اور چونکہ اردو کی ابتداء عوام کے میل جول کا نتیجہ تھی جو اس کے نام سے ظاہر ہے اور اسی وقت کی اسلئے سماج کا معیار شرافت مرتبہ اور دولت تھی، اس لئے جاگیر داری سماج عوام کو اجلات یعنی رذیل کے نام پکارتی تھی۔ لہذا وہ زبان بھی شرفاء یعنی امراء کے نزدیک تحقیر کی نظر سے دیکھی گئی۔ اشراف جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے اردو لکھنا بولنا اپنی ذلت سمجھتے تھے۔ اس عندے کا وجود غالب کے وقت تک تھا لیکن زبان انسان کے اختیار میں نہیں بلکہ انسان زبان کے بس میں ہوتا ہے، اس لئے اس زمانہ کے شرفاء و امراء اسی اجلات کی زبان کو اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے اور اردو جس کا مفہوم ہی ”سوقیت“ تھا اب ”اردو“ معنے ”قراری“ پر اب تک کہ وہ غالب بن کے لئے اردو تنگ تھی اردو ہی میں ایک نشان راہ چھوڑ گئے۔

مسلمانوں کے اس احساس برتری میں بابر کا خیال کا فرما تھا جسے ہندو معاشرت میں ہر چیز قابل منہک نظر آتی تھی اور اس لئے مسلمانوں سے یہ خیال کبھی ترک نہیں ہوا کہ وہ ہندوؤں سے برتر ہیں۔ چنانچہ ہندو ادبار و شعراء کے بہتر سے بہتر کلام میں بھی انہیں ہمیشہ ”بوسے کچوری“ آیا کی۔ اس خیال کا وجود شرر کی زندگی میں بھی ملتا ہے۔

بظاہر یہ خاص وجوہ ہو سکتے ہیں جن کی بنا پر ہندو تعلیم یافتہ جماعت کو اردو سے محبت کم ہوتی گئی اور دماغوں میں یہ بات جگہ بناتی رہی کہ اردو ہی مسلمانوں کی زبان۔

اس چیز کو ہماری ایک دوسری زبردست غلطی نے مرد پھونپائی اور وہ غلطی یہ تھی کہ برطانوی حکومت کی عیاری کو نہ سمجھ کر ہم ہندی کی تحریک کے مقابل بن بیٹھے، اور زبان کے مشترک درستے پر اپنے واحد حقدار ہونے کا اعلان کر دیا۔ نواب محسن الملک کی لکھنؤ کی تقریر کے بعد ہندو ہندی کی تحریک پراٹل ہو گئے، نواب محسن الملک گوشہ نشین کر دئے گئے اور ہندی کی سرپرستی کی جانے لگی۔

اُس وقت اگر مسئلے کو فریقانہ نظر سے نہ دیکھا جاتا تو اس سے زیادہ نہ ہوتا کہ عدالتی سمعوں پر ایک طرف ناگرمی حروف میں وہی زبان چھپ جایا کرتی۔ بالکل اُسی طرح جیسے تبلیغ و تنظیم کے وجود تک شادی شگھٹن کی تحریکیں شد و مد سے چلیں، مگر جب ہم تھک کر بیٹھ گئے وہ بھی ٹھپ ہو گئیں۔

ان بنیادی غلطیوں کے ساتھ ہم نے ایک اور غلطی بھی کی، یعنی بیسویں صدی کے شروع میں ہم نے زبان کو مشکل اور کھٹن بنانا شروع کر دیا اور اس بات کو بھول گئے کہ اسے ہندو بھی بولتے پڑھتے ہیں۔ اب چونکہ اُردو کی تعلیم حصول معاش کے لئے ضروری نہ تھی اور امتحان ہندی میں بہت آسانی سے پاس کئے جاسکتے تھے، ہندوؤں نے اپنے بچوں کے لئے اُردو کی تعلیم کو بالکل غیر ضروری اور نقصان کا باعث سمجھ کر اس کا پڑھانا بند کر دیا۔

اُس وقت بھی ہم ایک بڑی غلطی کے مرتکب ہو رہے۔ اُس وقت ہماری ساری توجہ زبان کو آسان بنانے سے کم قیمت پر کتابیں، اخبار اور رسالے چھاپنے اور اسکی تعلیم کو سہل بنانے میں صرف کرنا چاہئے، تعلیم بالذات پر انتہائی زور دینا چاہئے، مگر اس کے بدلے ہم بین و بکا اور شور و غوغا پر اتر آئے ہیں اور اس طرح خدا اور خدا کی آک بھڑکار رہے ہیں۔ یہ صورت اُردو کے حق میں خودکشی کے مترادف ہے۔

ہم شاید بھول گئے ہیں کہ دنیا دار مکافات ہے اور کوئی عمل ضائع نہیں ہوتا، رو عمل ضرور ہوتا ہے، یہ ایک فطری قانون ہے۔ زبان کی خود سرائے فطرت ہماری متعصبانہ کارروائیوں کو تو نہ چلنے دیگی لیکن جو ہندو آج اُردو لکھ پڑھ لیتے ہیں کل وہ بھی اُسے ترک کر دیں گے اور اُردو کا حلقہ اثر و عمل زیادہ محدود ہو جائے گا جو بالآخر نشر و اشاعت کی کمی کا باعث ہوگا۔ یہ حقیقت آج بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

آخر کلام پر ایک نظر اس پر بھی ڈال لینا چاہئے اور ممکن ہے کہ یہی توجہ ہماری کوششوں کے دھار سے کا رخ بھی بدل دے، کہ اس زبانی جھگڑے میں کس طبقے کے لوگ مبتلا ہیں؟ اس کا بتا چلانے کے لئے کسی گہرے سوچ اور غائر مطالعے کی ضرورت نہ ہوگی۔ ہم نے کبھی نہیں سنا کہ دو مزدور یا دو دیہاتی زبان اور کچھ کی بحث پر آپس میں لڑے ہوں یا انھوں نے کبھی ان چیزوں پر دھیان بھی دیا ہو۔ حقیقت میں ہندوستان کی پچانوے فیصدی آبادی ان چیزوں کے وجود سے بھی باخبر نہیں۔ ان کی سمجھ میں کبھی نہ آسکے گا کہ یہ بھی کوئی لڑائی جھگڑا ہے۔ کی بات ہو سکتی ہے اور جسے قوم یا جتنا بھا جاتا ہے وہ انہیں پچانوے فیصدی مزدور کسانوں سے عبارت ہے۔ چنانچہ ایک حقیقت کا تاریخی

ایک بے لوث سوچنے والا یہی نتیجہ نکال سکتا ہے کہ معنایہ زرگری جنگ ہے۔

اس کے سامنے یہ تاریخی حقیقت آئے گی کہ جاگیر داری حکومت نے مسلمانوں سے پہلے اور مسلمانوں کے عہد میں بھی عوام کو یہ موقع ہی نہ ملنے دیا کہ وہ اپنی حالت پر سوچ سکیں اور بادشاہت کی اس اسکیم میں مولوی برہمنوں سے مدد لیگی۔ چنانچہ ایک راجہ برہمن مشیر تو رکھتا تھا لیکن جوابدہ وہ کسی کے سامنے نہ تھا۔ ایک بادشاہ جب نعل اللہ ٹھہرا تو اس کی شکایت کیسی اور کی کس سے جائے؟ انتہا یہ ہے کہ خدا کے مہربان ہونے کی علامت شاہی عنایت و اکرام سمجھے گئے۔ حکومت کے اس ڈھنگ کو مضبوط بنانے میں ذاتوں کی تقسیم بہت کار آمد ثابت ہوئی اور اس سے مسلمان بھی اسی طرح متاثر ہوئے جتنے ہندو ہو چکے تھے۔ دھرم کرم اور تقدیر کا سبق سنا سنا کر غریب عوام کو سنجیدگی سے محسوس کر لینے کے ساتھ گہری قناعت سکھا دی گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ راج اور بادشاہی کی جڑیں مضبوط بنتی رہتی تھیں انسانی مساوات اور اسلامی اخوة کے عندے دفن کئے جا چکے تھے۔

سلطنت کے ساتھ خدا کے سائے کا خیال بہت گہرا قائم ہو گیا تھا اور اس خیال کے مستحکم ہو جانے کا لازمی نتیجہ یہ ہونا تھا کہ اتم کا نیچے پر اخراجات کا اجلاں پر سیاسی و اقتصادی غلبہ استمراری ہو جائے اور چونکہ اس سماجی و سیاسی اسکیم میں حد بندیاں سخت تھیں، اس لئے اتم اور نیچے دونوں سماجوں میں تنزل آنا لازمی چیز تھی اور اعلیٰ کو ادا کرنے پر جو بڑائی مل چکی تھی اس کی وجہ سے اقتدار یافتہ سماج میں بیکار اور ٹھلوے آدمیوں کی تعداد ملک میں بڑھتی رہی۔ مذہبی رہنما خیرات پر بسر کرنے لگا اور زمیندار معافی دار غریبوں کی محنت کا نتیجہ چھین کر کھانے لگا اور اس طرح بے شمار ٹھلوے موٹے اور دبیز ہوتے رہے۔ سماج کی یہ صورت مغلوں کے عہد میں نیم مذہبی بلکہ مذہبی عقیدے کی صورت میں ملک کے طول و عرض پر چھا گئی تھی۔

مغل حکومت کے زوال، اور ہندو ریاستوں کی باہمی رقابتوں نے انگریزوں کو تانمل کی دعوت دی، اور ہندو مسلمانوں کے یہی ٹھلوے اور مراعات و حقوق یافتہ طبقے انگریز کے ساتھ ہو گئے۔ انگریزی حکومت نے ان کی پوری پوری سرپرستی کی۔ انگریزی عہد نے ان رعایتوں کی حقدار جماعتوں میں کچھ اصناف ہی کیا۔ یعنی وکیلوں اور پیش خواروں کی انہی جماعتیں بھی پیدا کر دیں اور یہ دہی پرانی جاگیر داری حکومت کے پس ماندہ اور سامراجی ذریعات ہیں جو اپنی رعایتوں اور اقتدار کی خاطر پاؤں پیٹ رہے اور عوام کو ایسے بے بنیاد مسئلوں اور جھگڑوں میں پھنسا کر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اپنے مقصد اور برتری کی طرف سے ہمیشہ کی طرح غافل رہیں اور ان کے تفوق اور فربہ ہونے کے ذرائع یعنی کونسلوں کی گریباں اور وزارتیں محفوظ رہیں، قانون سازی کی مشین پر ان کا قبضہ ہو تاکہ ان کے ہاتھ سے وہ نہ نکل سکے جسے یہ صدیوں سے غصب کئے چلے آ رہے ہیں۔ برہمنی ذہنیت کا وہی پرانا سین پھر دیکھنے میں آ رہا ہے کہ زبان مخصوص طبقے کی چیز بنی۔ ہے علم و فن کی ٹھیکہ داری ان کے ہاتھ سے نہ نکلنے پائے۔

مگر چونکہ غریب کی اس مانگ کے سامنے کہ وہ بھوکا ہے، محنت کر کے بھی بھوکا رہتا ہے، کوئی طاقت ٹھہرنے والی نہیں، اس لئے ان مجبوروں اور قرضیوں کی بنیادیں کمزور ہیں اور بالآخر ختم ہو جانے والی ہیں، یہ جھگڑے بغیر چکائے چک جانے والے ہیں، لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب ملک کی سیاسی الجھنیں صاف ہوں گی اور صحیح و واضح سیاسی تصورات قومی لیڈروں اور مختلف جماعتوں کے سامنے آجائیں گے۔ مگر جماعتوں کے سیاسی تصورات اسی وقت صاف و واضح ہو سکیں گے جب عوام کی تحریکیں زور پکڑ کر درمیانی طبقے کی لیڈری کو ختم کریں گی اور عوام کے لیڈر عوام میں سے پیدا ہونے لگیں گے اس لئے کہ خاص طبقوں کی خاص رعایتیں ختم کرنے کا قانون درمیانی طبقوں کے نمائندے کبھی نہیں بنائیں گے۔ وہ تو مزدور نمائندے ہی بنا سکتے ہیں۔ بہر حال یہ وقت زیادہ دور نہیں۔ اس زمانے میں وقت کی رفتار کی تیزی ہمارے خیال میں نہیں آ سکتی۔ وہ بہت تیز ہو گئی ہے۔ آنے والے انقلاب کی جھلک اس ادب میں دکھائی جاسکتی ہے جو آجکل پیدا ہو رہا ہے لیکن اس کے باوجود وہ وقت اپنے وقت پر آئے گا۔

لیکن اگر ”مرد آخر میں مبارک بندہ ایست“ کی تعلیم سچی ہے، اگر زمانے سے ساز کر لینے کے اصول غلط نہیں، اگر انسانی مساوات فطرت کا منشاء ہے، اگر مسکین اور اُفتادہ کی مدد مذہبی فریضہ ہے، تو ہندوستان کے ان ”رعایت خور“ طبقوں کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو عوامی تحریکوں سے وابستہ کر دیں، اقتدار اور استحصال سے باہتہ اُٹھالیں، اور انسانیت اور اپنے ملک کے لئے ایک معزز مقام حاصل کرنے میں لگ جائیں، یعنی غلامی کی لعنت کو اپنی اور اپنے ملک کی پیشانی سے دھو ڈالیں۔ دوسرے ملکوں میں ”رعایت خور طبقوں“ کے اکثر افراد نے اس کو سمجھا اور اس پر عمل کیا ہے۔

ل۔ احمد۔

نگار کے پرانے پرچے

نگار کے مندرجہ ذیل پرچے دفتر میں موجود ہیں جن کی دود و تین تین کاپیاں دفتر میں رہ گئی ہیں جن اصحاب کو ضرورت ہو طلب کر لیں قیمتیں وہی ہیں جو سامنے درج ہیں :- (۱۲۶) جنوری ہر - (۱۳۷) مئی ہر -
 (۱۳۸) جولائی تا دسمبر ہر فی پرچہ - (۱۳۹) جنوری ۱۲ فروری تا دسمبر (علاوہ اپریل، اگست و اکتوبر) ہر فی پرچہ
 (۱۴۰) فروری و جولائی ہر - (۱۴۱) فروری ہر - (۱۴۲) فروری، مئی، جولائی، اگست، اکتوبر و نومبر
 دسمبر ہر فی پرچہ - (۱۴۳) جنوری ہر - فروری تا دسمبر (علاوہ مئی جون و ستمبر) ہر فی پرچہ - (۱۴۴) جنوری ہر
 مارچ تا اگست ۶ فی پرچہ -
 بینبر نگار۔ لکھنؤ

اشتراکیت اور اس کا مستقبل

غلامی کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد افراد قوم کی قوت فکریہ بھی غلامانہ ذہنیت کی شکار ہو جاتی ہے۔ اجتماع اور غور و فکر کا مادہ رخصت ہو جاتا ہے اور قوم کی قوم اندھی تقلید میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ہندوستان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ جس کا آج سے نہیں تقریباً نصف صدی سے رونا رویا جا رہا ہے لیکن غضب تو یہ ہے کہ وہی حضرات جو ہمیں پکار پکار کر اس و ماغی غلامی سے باخبر کر رہے ہیں۔ اب تک اس لعنت سے اپنی گلو خلاصی نہیں کر پائے ہیں۔ ان مادیان قوم کے لئے کسی مسئلہ پر عقل و درایت سے غور کرنا قطعی ممکن ہے۔ کسی مسئلہ کی خوبیوں کی دلیل ان کے پاس عموماً یہی ہوا کرتی ہے کہ ”چونکہ یہی اقوام دوسرے ممالک میں کامیاب ثابت ہو چکے ہیں ہمارے یہاں بھی بامراد ہونگے انقلاب فرانس نے فرانس کو حیات نو بخشی۔ روس میں اشتراکیت ایک حد تک کامیاب ثابت ہوئی۔ جرمنی اور اٹلی میں ہٹلر اور موسولینی کی مطلق العنانی نے سحر سامری کا کام کیا۔ ہندوستان میں بھی اگر وہی ماحول پیدا کر دئے جائیں تو یہاں بھی وہی نتیجے نکلیں گے جو دوسری جگہ ظاہر ہوئے“ لیکن ایسے حضرات اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ واقعات عالم تکرار سے یکسر معزا اور متبرک ہیں اس رواں دواں دنیا میں ایک ہی چیز دو دفع نہیں ہوتی آراگون کا مسئلہ اب بہت فرسودہ ہو گیا۔ احباب کی صحبتوں میں اس پر خوش گپیاں تو بیشک ہو سکتی ہیں۔ لیکن قوم و ملک پر اس کا تجربہ ایک جہلک مشغلہ ہے۔ اس قسم کی کورانہ تقلید کی بین مثال موجودہ دور میں سوشلزم یا اشتراکیت کا تصور ہے۔ عوام کے لئے تقلید تو خیر ناگزیر ہے۔ لیکن حیرت تو یہ ہے کہ ہمارے خواص بھی جب سوشلزم کا ذکر آتا ہے تو غیر تقلیدی انداز اختیار کئے بغیر نفس مسئلہ پر غور کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس سوشلزم بلکہ کمیونزم کی خوبیوں کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ روس ایسا تباہ حال ملک بھی اسی نے بدولت آج دنیا کے تمدن ممالک سے ہم سری کا دعویٰ کر رہا ہے اور یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ خود روس کے ارباب حل و عقد اپنی کامیابیوں پر حیرت زدہ ہو رہے ہیں یہی تقلیدی انداز گفتگو ہے جو مادیان اشتراکیت کی سب سے بڑی دلیل سمجھی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج انقلاب روس کے قصیدوں کی صدا گوشے گوشے سے بلند ہو رہی ہے۔

بیجانہ ہوگا اگر پہلے اسی خواب خوش آئند کی تعبیر بیان کر دی جائے بعدہ نفس مسئلہ یعنی سوشلزم کی طروت

رجوع کیا جائے یہ دعوے ایک حد تک صحیح ہے کہ روس میں جو کچھ ہوا وہاں کے لئے وہی مناسب تھا۔ بولشویزم نے ۲۰-۲۲ سال میں روس کے لئے وہ سب کچھ کر دیا جو صدیوں کی آمریت نہ کر سکی تھی۔ لیکن سوال تو یہ ہے کہ جو کچھ وہاں ہوا کیا اس کا امکان یہاں بھی ہے۔ کیا روس کی تقلید یہاں بھی کارگر ہو سکتی ہے؟

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ روس اور ہندوستان کے ماحول میں بہت زیادہ مشارکت ہے۔ روس بھی ہندوستان ہی کی طرح ایک پست۔ فلاکت زدہ۔ جاہل۔ زراعتی ملک تھا ہندوستان کی طرح وہاں بھی ساہوکار اور زمیندار جو ملک کی طرح کاشتکاروں اور مزدوروں کا خون چوس رہے تھے۔ وہاں کی حکومت بھی ہندوستان ہی جیسی ایک غیر ذمہ دار بیوروکریسی تھی وہاں بھی حکام وقت زار سے لیکر ادنیٰ چوکیدار تک اتنے ہی ظالم و جابر تھے اس لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ کمیونزم وہاں تو رحمت ثابت ہو اور یہاں کے لئے قہر ہو جائے؟ لیکن اہل نظر ان سطحی مشارکتوں کے فریب میں نہیں آسکتے ہیں۔ روس اور ہندوستان میں سب سے بڑا فرق تو یہ ہے کہ ہندوستان ایک غلام ملک ہے اور روس ایک آزاد ملک تھا۔ روس میں غیر ملکی سنگینوں کے بل پر زار کی حکومت نہیں قائم تھی بلکہ وہ روسیوں ہی کی تلواریں تھیں جو انہائے وطن کو ذبح کر رہی تھیں۔

دوسری بات یہ کہ روس میں بولشویزم کی کامیابی محض لیڈروں کی اسپیچوں اور اخبارات کے جوشیلے مضامین کی رہین منت نہیں ہے۔ وہاں جو کچھ ہوا ایک حد تک بزرگ شمشیر یعنی جبر ہے ہوا۔ جنگ عظیم کی تباہ کاریوں سے پورا ملک مہرباب تھا۔ حکومت کی سختی نیز اشیائے خورد و نوش کی کمی سارے ملک کو مع افواج کے بغاوت پر آمادہ کئے ہوئے تھی۔ دتھ پا کر ایک منظم جماعت اٹھی۔ فوج نے اس کا ساتھ دیا اور اس نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ خوب خانہ جنگیاں ہوئیں اور آخر کار خون کی ندیاں بہا کر پولشوک جماعت برسر اقتدار ہو گئی اور پھر ہر ممکن جبر و ظلم و تعدی کو بروئے کار لا کر پورے ملک میں اشتراکیت کا بول بالا ہو گیا۔

روس میں پولشوک جماعت کی کامیابی کا تیسرا سبب یہ ہوا کہ وہاں اشتراکیت کا جبر اور اس کے لئے فساد جنگی اس وقت شروع ہوئی جب جنگ عظیم نے دنیا کی تمام حکومتوں کو جنگ کے تکان نیز اس کی تباہ کاریوں کے ہرگز سے پریشان کر رکھا تھا اور خانہ جنگی کے زمانہ میں کسی کو دخل دینے کی ہمت نہ تھی۔

جب واقعات کا یہ عالم ہو تو کیسے کہا جاسکتا ہے کہ دونوں جگہ حالات تقریباً یکساں ہیں۔ اور جو طریقہ وہاں اختیار کیا گیا وہی یہاں۔ کہئے بھی مناسب ہوگا۔ ہندوستان کے لئے پہلا سوال حصول آزادی کا ہے اور تا وقتیکہ ہم خود مختار نہیں ہو جاتے ہیں، سوشلزم، کمیونزم یا بولشویزم کی باتیں محض شاعری ہیں اور کچھ بھی نہیں۔ سوشلزم اور ہمارا منزل مقصود ہوتا ہوا کرے لیکن مقصد اور ذریعہ میں تمیز نہ کرنا حد درجہ کی بدتمیزی ہے۔ یہ تو محض زبانی باتیں ہیں کہ سارے کا سارا ہندوستان صرف ہمارے لیڈروں کی اسپیچ بازیوں سے اشتراکیت بن جائے گا۔ ایسے لئے

انہیں یہاں بھی وہی کچھ کرنا پڑے گا جو روس میں کیا گیا اور تا وقتیکہ ہندوستان آزادی کامل نہ حاصل کرے۔ روس کی بے باکانہ اور سفاکانہ روش نہیں اختیار کر سکتا ہے۔ مزید براں اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ سبھاش بابو کی چھ مہینے والی دھمکی کارگر ہو گئی اور برٹش حکومت کا خاتمہ بھی ہو گیا تو کیا یہ قرین عقل ہے کہ اُس وقت ہندوستان بیرونی دشمنوں کا کچھ خیال کئے بغیر اشتراکیت کی ترویج شروع کر دے گا۔ جبکہ یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جبر و تعدی ہی نہیں بلکہ خانہ جنگی کے بغیر یہاں اشتراکیت کے پانوں جتنے نہیں نظر آتے۔

پھر سمجھ میں نہیں آتا۔ اس خواب پریشاں کے پیچھے اتنی اہم چیزیں یعنی ملک کی آزادی اور آپس کی رواداری کیوں پس پشت ڈالی جا رہی ہیں۔ کیوں عوام کو دام فریب میں مبتلا کیا جا رہا ہے۔ اور کیوں ایک بے بنیاد افسانے کی خاطر ایک تباہ کن خانہ جنگی کی داغ و بیل ڈالی جا رہی ہے؟ میں پھر عرض کر دوں گا کہ اگر سوشلزم یا اور کوئی ازم ان کی غرض و غایت ہے تو اسی کو ذریعہ حصول سمجھ لینے کی غلطی نہ کریں اور مقصد اور ذریعہ حصول مقصد کا فرق سمجھیں۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ ہندوستان اور روس کے حالات اتنے مختلف ہیں کہ وہاں کی تقلید ہندوستان کے لئے کبھی بھی مناسب نہیں ہوگی۔

یوں تو اشتراکیت کی تعریف میں صفحے کے صفحے رنگے جاسکتے ہیں لیکن ایک جملہ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اشتراکیت انفرادیت کی ضد ہے۔ انفرادیت میں شخص واحد ہی سب کچھ ہوتا ہے اور اپنے نفع اور نقصان کے لئے وہ آزاد ہوتا ہے کہ جو چاہے کیے اُس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہے۔ بشرطیکہ اس کے حرکات و سکنات براہ راست دوسروں کے لئے مضرت رساں نہ ہوں۔ اس کے برعکس اشتراکیت مقتضی ہے کہ فرد واحد کی شخصیت جماعت میں جذب ہو جائے۔ افراد سے زیادہ جماعت کے نفع و نقصان کا خیال رکھا جائے اور زیادہ سے زیادہ اختیار اسے معاشرے کے ہاتھ میں دے دئے جائیں کہ یہ مجموعی طور پر افراد کی ضروریات کو بطریقہ احسن انجام دے سکے۔

سوشلزم یا اشتراکیت بہت وسیع معنی کا لفظ ہے اس کا اطلاق جس طرح روس کے محدود کمیونزم پر ہو سکتا ہے اُسی طرح جرمنی اور اٹلی کے ناززم اور فاشزم پر بھی ہو سکتا ہے۔ یہی کیوں اسٹریلیا۔ کنیڈا۔ جنوبی افریقہ ہی نہیں بلکہ انگلستان۔ فرانس اور امریکہ تک کو غیر اشتراکی نہیں کہہ سکتے۔ موجودہ زمانہ میں اشتراکیت سے پرہیز قطعاً ناممکن ہے۔ تہذیب و تمدن اور اقوام عالم کے عروج و زوال کی تاریخ پر ایک بے لاگ اور عمیق نظر ڈالنے سے اس نتیجہ پر پہنچے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ دنیا تدریجی رفتار سے اشتراکیت کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ انفرادیت دن بہ دن رو بہ انحطاط ہے۔ فطرت کے اولین انسان کی مہیب انفرادیت کا تو خیر ذکر ہی فضول ہے ہزار ہزار بلکہ صدی دو صدی کے معاشرے کا موازنہ اگر آج کے معاشرے سے کیا جائے تب بھی انفرادیت پر اشتراکیت کا تصرف بہین طور پر نمایاں ہو جائے گا۔ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ایک ہی صدی کے اندر دنیا کی ریاستوں میں جو انقلابات ہو گئے ہیں انکا جائزہ لیجئے

یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ہماری روز کی زندگی پر غیر محسوس طور پر ریاست کا قبضہ ہوتا چلا جا رہا ہے اور تمام وہ امور جو کچھ دن قبل ہمارے ذاتی اختیار و اقتدار میں تھے ریاست کے تصرف میں آئے جاتے ہیں۔ انگلستان اور امریکہ ہی پر اس خیال کو دماغ میں رکھ کر ایک غیر متعصبانہ نگاہ ڈالی جائے تو ظاہر ہو جائے گا کہ یہ ممالک بھی کتنے اشتراکی ہو گئے اور کس تیزی سے اشتراکیت کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور اس کے بعد حضرات سوشلسٹ کی صدائے بے ہنگام پر ماتم کیجئے کہ باوجود اپنے دعوؤں کے یہ نفس سوشلزم سے کس قدر دور ہیں۔ ان کے نزدیک ایک سوشلسٹ حکومت کا قیام ہی سب کچھ ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ تا وقتیکہ تدریجی رفتار سے کسی چیز کی ترویج نہ ہو، اس کے نتائج کتنے برے ہوتے ہیں۔ قیام بولشوزم کے بعد روس کی اندرونی سازشوں، بغاوتوں حکومت کی سخت گیریوں اور خون ناحق کی یہ تک حضرات اب تک نہیں پہنچ سکے ہیں۔ شاید ان کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ بہ نسبت روس کے اشتراکیت نے فرانس، امریکہ اور انگلستان میں ترقی کے منازل زیادہ طے کئے ہیں اور ان ممالک میں اس کا مستقبل زیادہ روشن ہے۔

اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ دنیا دن بہ دن اشتراکی ہوتی چلی جا رہی ہے اور انفرادیت کا میدان عمل کم ہوتا چلا جا رہا ہے لیکن غور طلب امر یہ ہے کہ کیا کوئی دن ایسا بھی آنے والا ہے جب انفرادیت کا بالکل خاتمہ ہو جائے گا اور اسکی جگہ انتہائی درجہ کی اشتراکیت یعنی اشتمالیت لے لیگی اشتمالیت یہ ہے کہ فرد اپنے جملہ امور کو جو اس کے بقائے حیات کے لئے ضروری ہیں ریاست کے حوالہ کر دے اور ریاست اپنے سراسر کے ضروریات زندگی کی کفالت کی ذمہ داری لے لے بہ الفاظ دیگر اشتمالیت ریاست اور فرد کے درمیان ایک معاہدہ ہے۔ جس کی رو سے فرد اپنی کل کائنات نیز ذاتی خدمات بھی ریاست کے حوالہ کر دیتا ہے۔ اس کے بدلے ریاست ذمہ لیتی ہے کہ وہ افراد کی ضروریات زندگی کو پورا کرے گی فاقہ کشی کی نوبت نہ آنے دے گی۔ بے روزگاری کا خاتمہ کر دے گی۔ امیر و غریب، آقا و غلام کی تفریق مٹا دے گی۔ اور اب سوال یہ ہے کہ کیا رفتہ رفتہ اس قسم کی اشتمالیت انفرادیت کے گھنڈروں پر آباد ہو جائے گی؟ اس کا جواب تو وہی ہے جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ انفرادیت اشتراکیت کی ضد ہے اور یہ امر مسلمہ ہے کہ کسی چیز کے بقا و قیام کے لئے اجتماع ضدین بہت ضروری ہے۔ ایک ضد کا عدم دوسرے کے فنا کا بھی پیش خیمہ ہوا کرتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ایک دوسرے پر قائم ہے۔ بغیر رات کے دن کا تصور بھی محال ہے کہنے والے تو یہاں تک کہ گئے ہیں کہ اگر شیطان نہ ہوتا تو خدا تک اپنی خدائی کا اظہار نہ کر سکتا۔

اشتمالیت میں فرد واحد کی شخصیت بالکل محو ہو جاتی ہے اور اس کی حیثیت ایک مشین کے پرزے سے کچھ زیادہ نہیں رہ جاتی نہ تو اس کا اپنا دماغ رہ جاتا ہے اور نہ اپنے اقوال و افعال۔ دوسرے کے سکھائے سیکھتا ہے اور دوسرے کے چلائے چلتا ہے۔ اس کی اپنی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ نہ اپنا کوئی مقصد ہوتا ہے جس کے حصول کے لئے جدوجہد کرے۔ اور نہ کوئی منزل ہے جس کے لئے مروانہ وار قدم بڑھائے۔ جیتا ہے تو دوسروں کے لئے مڑتا ہے تو غیروں کے لئے

غرض انسانیت اُس سے رخصت ہو جاتی ہے اور غریب ولی ہو کے رہ جاتا ہے۔ معاشرہ ہے کہ اُس انجن کی طرح جس کا کوئی انجنیر نہیں حرکت کئے چلا جا رہا ہے۔ جس کے پاس بقائے حیات کے لئے نہ تو کوئی جدوجہد ہے اور نہ آئندہ ترقیوں کے لئے تدابیر و زرائع۔ وجہ اس کی صرف اتنی ہے کہ معاشرہ کی شخصیت تو یہی ہے کہ وہ افراد پر مشتمل ہے۔ اور جب افراد ہی سے احساس خودی رخصت ہو گئی تو معاشرہ میں کہاں سے آجائے گی؟ اور ظاہر ہے کہ جب افراد کے قوائے عقلی اس طرح معطل کر دئے جائیں تو اس کا اثر خود معاشرہ پر کیا نہیں پڑے گا؟ کیا پوری جماعت اس بربادی سے گھائے میں نہیں رہے گی اور کیا انسانیت کے لئے یہ پیام مہلت نہیں ہوگا؟

استقامت کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ ہر فرد بشر اپنی خودی کو بالائے طاق رکھ کر خود کو دوسروں کا خادم بنائے۔ تصور تو یقیناً بہت پاکیزہ اور بلند ہے۔ اتنا بلند کہ خود انسان ابھی اس سے منزلوں نیچے ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے خود انسانیت ہی اس کا ساتھ چھوڑ دے۔

لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انسان اس طرح بے خود ہو کر حضرت عیسیٰ یا مہاتما بودھ ہو بھی گیا تو دیکھنا یہ ہے کہ اس کا اثر خود معاشرے پر کیا ہوگا۔ جون سٹوارٹ مل نے اپنے شہرہ آفاق مقالے آزادی میں اس کا جواب دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن استقامت کے دلدادوں کو اس کے مطالعہ سے کب فرصت ہے کہ اس دنیا کی باتیں کریں۔ یا سی اور مہاشیاتی پہلو سے قطع نظر ظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ آج تک دنیا نے جتنی ترقیاں کیں سب انفرادیت کے کوششوں ہیں۔ جتنے ایجادات و اختراعات ہوئے سب کے پس پر وہ یہی قوت کار فرما تھی اور انسان جو آج زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہے سب اسی کی برکتوں کا فیض ہے۔ اور اب کیسے یقین کر لیا جائے کہ ابتدائے آفرینش سے دنیا جس راستے پر گامزن ہی رہی یکایک اس کے بالکل برعکس چلنے لگے گی۔ یہ تو درست ہے کہ زمانہ ایک ہی رفتار پر برابر نہیں چلتا رہتا ہے۔ لیکن یہ بھی اتنا ہی قطعی ہے کہ وہ کبھی بھی اتنا نہیں بہک سکتا کہ ماضی کو بالکل فراموش کر دے۔ اگر معاشرے کو برقرار رکھنا ہے تو فرد کی علیحدہ شخصیت بھی قائم رکھنی پڑے گی۔ اگر جماعت کی ترقیوں کو جاری رکھنا ہے تو فرد واحد کی ذاتی منفعت اور منفعت کی ذمہ داری ایک حد تک فرد ہی کے ہاتھوں چھوڑ دینی پڑے گی۔ بڑے لوگوں سے ہمیشہ یہی غلطی ہوتی آرہی ہے کہ اعتدال کے دامن کو چھوڑ کر وہ سہرا ہم مسئلہ کو انتہا تک لے آئے ہیں دوسرے علوم میں اس انتہا پسندی سے پہلے ہی چشم پوشی کی جائے۔ لیکن اجتماعیات میں اس سے انحراف ایک جہلک فروگزاشت ہے۔ انسان نہ تو ایک مشین ہے اور نہ ایک خود رو پوۓ اور میکانیکی نظریوں کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ ان کے حامی جادہ اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں ورنہ دونوں نظریوں کی بنیاد صداقت و حقیقت پر مبنی ہے اور ایک حد تک دونوں فطرت انسانی کے ترجمان ہیں۔

یہی حال انفرادیت اور اشتراکیت کی بحث کا بھی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم اشتراکیت کی طرف بڑھ رہے ہیں

لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ہم کسی دن اتنے اشتراکی ہو جائیں کہ انفرادیت کا بالکل خاتمہ ہو جائے۔

گلاب چند

(نگار) مقالہ نگار نے اس مضمون میں اشتراکیت کی مخالفت کی ہے اور میں نے اسے نگار میں صرف اس لئے شایع کیا ہے کہ جب تک کسی مسئلہ کے متعلق ہر مخالفانہ پہلو کو سامنے رکھ کر لوگوں کے دلوں سے ہر ممکن خدشہ کو دور نہ کر دیا جائے، ہم اسے مقبول عام نہیں بنا سکتے۔

میں اشتراکی ہوں، نگار کا مسلک اشتراکیت ہے اور میں پورے یقین کے ساتھ یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ انسانیت کی نجات اشتراکیت ہی میں پنہاں ہے اور وہ زمانہ آنے والا ہے، جب ساری دنیا اسی طرف کھنچ کر آئے گی، لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کو یہ جبر کسی کے سر تنہو پا نہیں جا سکتا اور تا وقتیکہ ہم لوگوں کے دلوں میں اس کی صداقت کی طرف سے یقین کی کیفیت نہ پیدا کر دیں اس کی ترویج ممکن نہیں۔

اس وقت اشتراکیت کے مخالف تین گروہ ہیں، ایک سرمایہ دار دوسرے اہل مذاہب اور تیسرے وہ جو آمرانہ ذہنیت رکھتے ہیں اور اپنے تقدم شخصی کو ہاتھ سے جانے دینا گوارا نہیں کر سکتے۔

سرمایہ دار کی مخالفت تو ظاہر ہے کہ وہ یہ کیونکر گوارا کر سکتا ہے کہ اس کی جمع کی ہوئی دولت جس کا بڑا حصہ اس کے ناجائز عیش و تنعم میں صرف ہوتا ہے اور جس کے طفیل وہ غریب مزدوروں پر حکومت کرتا ہے ہاتھ سے نکل جائے، مذاہب نے اب جو صورت اختیار کر لی ہے، وہ بھی چونکہ ایک نوع کی سرمایہ داری ہے انکی مخالفت بھی ظاہر ہے، رہے آمرانہ ذہنیت رکھنے والے سو ان کو اختلاف کرنا ہی چاہئے کیونکہ استبداد و اشتراکیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

مخالفین اشتراکیت کی سب سے بڑی دلیل ایک یہ ہے کہ اشتراکیت، اصول فطرت کے خلاف ہے فرق مراتب قدرت کی پیدا کی ہوئی چیز ہے اور یہ دنیا سے محو نہیں ہو سکتی، لیکن یہ دلیل سراسر فریب ہے کیونکہ اشتراکیت فرق مراتب مٹانے کا نام نہیں ہے اور نہ ساری دنیا کی ذہنیت کو ایک کر دینے کا، بلکہ اشتراکیت کا مدعا دولت کو اس طرح بانٹ دینا ہے کہ دنیا سے فقر و فاقہ کی بلا دور ہو جائے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ خدا کا مقصود اپنے بندوں کے پیدا کرنے سے یہ بھی ہو کہ ان میں سے بعض کو اسراف کی حد تک دولت دیدیجائے اور بعض کو گدائی کی حد تک مجبور کر دیا جائے۔ اگر دنیا کے اخلاقی قوانین الہامی چھیر نہیں ہیں بلکہ سوسائٹی کے تجربات سے پیدا ہوئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہماری معاشی و تمدنی دشواریاں آخر کار ہم کو کسی ایسے قانون کے بنانے پر مجبور نہ کریں۔

جن سے ان دشواریوں کا ازالہ ہو جائے اور اس بات کو تو اشتراکیت کے دشمن بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اشتراکیت کا مقصد انہیں اقتصادی پیچیدگیوں کو دور کرنا ہے۔ لیکن اس کو وہ قابل عمل نہیں سمجھتے اور اس لئے فیصلہ کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ اشتراکیت قابل عمل ہے یا نہیں۔ فاضل مقالہ نگار نے ہندوستان کو سامنے رکھ کر زیادہ تر اس پہلو پر زور دیا ہے اور ان کے نزدیک یہاں کے حالات اس کے موافق نہیں ہیں۔ ایک حد تک میں بھی اس کا موید ہوں، لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ اس تحریک کو بند کر دیا جائے کیونکہ اس صورت میں ہم کسی وقت بھی حالات کو اس کے موافق نہ بنا سکیں گے اور ہندوستان ہمیشہ غیروں کی گرفت میں رہے اسی طرح فقر و فاقہ کی مصیبت میں مبتلا رہے گا۔

یہ بالکل درست ہے کہ اگر آج انگریز ہندوستان کو چھوڑ کر نکل جائے تو ہم کسی ملک کے حملہ کا جواب نہیں دے سکتے اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ کوئی اور اس پر قابض ہو جائے گا، لیکن اشتراکیت پسند جماعت شاید اس قدر احمق نہیں ہے کہ وہ اس حقیقت کو نہ سمجھ سکے۔ اس کا مطالبہ آزادی اگر اصول اشتراکیت پر مبنی ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ انگریزوں سے نفرت کرتا ہے یا ان کو یہاں سے بالکل نکال دینا چاہتا ہے، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ اصول حکومت اشتراکی قرار دیا جائے، یہاں کی دوائیں یہیں رہیں اور یہاں کے انسان یہاں کی پیداوار اور یہاں کی ذہنیت سے اس طرح کام لیا جائے کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت آپ کر سکے۔ یہاں آدمیوں کی کمی نہیں، معدنیات کا فقدان نہیں، جسمانی و ذہنی قوت مفلوج نہیں، اگر کمی ہے تو صرف اس بات کی کہ ان سے کام نہیں لیا جاتا اور یہ کام نہ لیا جاتا بدستور اس وقت تک قائم رہے گا جب تک ملک پوری طرح آزاد نہ ہو اور صنعت و حرفت تجارت و مہارت حکومت کے ہاتھ میں نہ آجائے، کہ دولت کی صحیح تقسیم کی صورت صرف یہی ہے۔

مقالہ نگار کا یہ اعتراض کہ اشتراکیت میں انفرادی خصوصیات مٹ جاتی ہیں اور ان کے ابھرنے کا موقع نہیں ملتا، صحیح نہیں۔ روس کو دیکھئے کہ وہاں کوئی اشتعال علم و فن ایسا ہے جو ترقی نہ کر رہا ہو۔ دور اشتراکیت میں وہاں جتنے بڑے سائنس دان اور ماہرین فنون پیدا ہوئے ہیں، دو تیسریں میں ان کا کہیں پتہ نہ تھا۔

اشتراکیت پر یہ الزام قائم کرنا بھی غلط ہے کہ وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کرتی ہے، اشتراکیت کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کی اہلیت سے بڑی طرح کام لیا جائے اور اس کی جملہ ضروریات زندگی فراہم کرنے کی ذمہ داری حکومت اپنے سر لے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ ایک معمولی مزدور اور ایک اچھے ڈاکٹر کی ضروریات زندگی میں کیا فرق ہے اور وہ اس کا پورا لحاظ رکھتی ہے، اگر وہ یہ دیکھتی ہے کہ ایک شخص بغیر موٹر کے کام نہیں کر سکتا تو اسے پریل چلنے پر مجبور نہیں کرتی، لیکن جذبہ عیش و تنعم کو ضرور فنا کر دینا چاہتی ہے کہ اخلاق و انسانیت کے انحطاط و زوال کا تہا سبب دنیا میں یہی ہے۔

یہ درست ہے کہ جمہوریت کی کسی بھی وسیع صورت فرض کر لی جائے، آمریت بدستور قائم رہے گی، روس میں اگر

لیتے نہیں رہا تو اشتالین موجود ہے۔ لیکن سوال ہمیشہ اصول کا ہوا کرتا ہے اور اسی کی صحیح تعیین اشتراکیت کا نصب العین ہے۔ گو اشتالین آمرانہ حیثیت رکھتا ہے لیکن وہ زار بھی نہیں ہو سکتا۔ زار کے باوچی خانہ کا خرچ لاکھوں روپیہ تھا اور اشتالین صرف ساٹھ روپیہ لیتا ہے۔ پھر اگر استبداد و آمریت کا یہ فرق معمولی فرق نہیں ہے تو محض اصطلاح پر لڑنا جھگڑنا کہاں کی عقلمندی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ انسانیت پر جو مظالم ہو رہے ہیں وہ کیونکر دور ہو سکتے ہیں۔ ملکیت و استبداد کا تجربہ ہو چکا، مذہب و کلیسا کا دور بھی دیکھ لیا گیا، سرمایہ دارانہ حکومتوں اور ڈاکر سی کے نام سے عیاشیاں کرنے والی سلطنتوں کا حال بھی ہمیں معلوم ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان سب سے علیحدہ ہو کر کوئی اور نئی صورت نہ سوچی جائے اور اس وقت وہ نئی صورت سوائے اشتراکیت و اشتمالیت کے اور کوئی نہیں ہے۔ اگر تجربہ سے یہ بھی ناکام ثابت ہوئی تو کوئی اور راہ دیکھی جائے گی۔ زمانہ کے ساتھ ہمارے داعیات بدلتے رہتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ ایک وقت وہ آئے جب اشتراکیت بھی ناکافی ثابت ہو اور مکمل عدلیت کی طرف رجوع کیا جائے۔

جب ایک قوم میں انحطاط پیدا ہوتا ہے تو اس کی ذہنیت یہی ہو جاتی ہے کہ وہ ہر اقدام سے ڈرنے لگتی ہے اور اپنے مستقبل کو وہ نہایت مایوسی کی نگاہ سے دیکھتی ہے حالانکہ اپنے آپ کو طوفان میں ڈال دینا ہی ساحل تک پہنچنا ہو

در بلا بودن بہ از بیم بلاست

آپ کے فائدہ کی بات

اگر حسب ذیل کتابیں آپ علیحدہ علیحدہ خرید فرمائیں گے تو حسب ذیل قیمت ادا کرنا پڑے گی اور محصول علاوہ ہوں۔

نگارستان جمالستان ترغیبات حبسی شہاب کی سرگزشت استفسار و جواب ہر سہ جلد

دو روپیہ چار روپیہ تین روپیہ ایک روپیہ نو روپیہ
معرکہ سخن مکتوبات نیاز اردو شاعری ہندی شاعری میزان کل

ڈھائی روپیہ ڈھائی روپیہ دو روپیہ ڈیڑھ روپیہ ستائیس روپیہ آٹھ آنے

لیکن

اگر یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب فرمائیں تو صرف بیس روپیہ میں مل جائیں گی اور محصول بھی ہمیں ادا کریں گے۔

منیجر نگار لکھنؤ

عزیز لکھنوی کی غزل گوئی

اُردو غزل گوئی کی ترقی و ارتقا کی تاریخ میں عزیز کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جس مرکز پر وہ ہیں وہاں نہ صرف بہت سی راہیں ختم ہوتی ہیں بلکہ بعض نئی راہیں بھی کھلتی ہیں۔ اس لئے عزیز اپنی جگہ صفت اول کے غزل گو قرار دئے جاسکیں یا نہیں لیکن تاریخ نے ان کی حیثیت سنگ میل (stone mark) کی بنیاد دی ہے جسے سفر کرنے والے کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ آرٹ اور ادب کی دنیا کو ایک یہ خصوصیت حاصل ہے کہ یہاں کوئی چیز ایک شہاب ثاقب (meteor) کی طرح نظروں کے سامنے آکر ادھل نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس دنیا کی ہر سحر میں ایک نئی شام اور ہر شام میں ایک نئی سحر کا انتظام ہوتا ہے۔ ورڈ سو رتھ، کیٹس، شیلے، بائرن حادثات زمانہ کا کوئی شعبہ نہ تھے۔ بلکہ ان کے لئے ایک راہ تیار کی گئی تھی اور اس راہ کے مکمل ہو جانے پر ہی ان کا وجود ممکن ہو سکا۔ یہ راہ تیار کرنے والے کون تھے؟ یہ کوئی راز کی بات نہیں۔ گرے، کولنس، برنس، بلیک معروف نام ہیں۔ اُردو غزل گوئی میں کچھ ہی مرتبہ عزیز کو حاصل ہے۔ ان کا کلام آئینہ ہے ان تمام خصوصیات تغزل کا جو قدیم غزل کے تصور میں شامل تھیں۔ ان کا کلام خاکہ ہے ان خطوں سے مرتب جو آگے بڑھ کر جدید رنگ تغزل کی تصویر کھلائے اور ان کا کلام نمونہ ہے جدید تغزل کی ان گونا گوں دلچسپیوں کا جس پر آج ہم لوگ بجا طور پر نازاں ہیں۔

قدیم تغزل مرگاں کے تیر۔ دل و جگر کے ٹکڑے۔ رقیب کے شکوہ، محبوب کی سرد مہری، ہجر کے صدمے، وصل کی ہوس، موت کی بیماری اور اس کے باوجود آنے والے کے انتظار میں نہ مرنے کی نوع کے جزئیات سے مرتب تھا۔ میں نے اس وقت تک قدیم تغزل کے سلسلہ میں دہلی اسکول اور لکھنؤ اسکول کے درمیان کوئی خط امتیاز نہیں کھینچا ہے۔ لیکن اس وقت یہ کہہ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ جس وقت لکھنوی شعراء نے اپنے تغزل کی مصنوعیت (Artificiality) سے بیدار ہو کر جذباتی ضرورتوں کو محسوس کیا تو غزل کو اچھا خاصہ مرثیہ بنا دیا۔ ان کے نزدیک وہ غزل غزل ہی نہ رہی جس میں شاعر کے ایک بار درد نہ ہو یا وہ خون کے آنسو نہ روئے یا اس پر نزع کا عالم طاری نہ ہو یا چارہ گرمی نہ فرمائی جائے یا محبوب موت کا پیغام نہ کر دے۔ عزیز کے یہاں دہلی اسکول کی بیکسی اور لکھنؤ اسکول کا مرگھٹ پن دونوں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ دیوانہ سازی و دیوانہ گرمی کے انداز بھی وہی ہیں اور آداب محبت اور ان کے

جزئیات میں بھی وہی ہمواری موجود ہے۔ سنئے :-

یہ کہہ کے سر ہانے سے وہ بیمار کے اٹھے
نثار اس بچپنے کے اور اس نازک دماغی کے
ذکر مزاج ناز کرو مشورہ یہ ہے
انا کہ ہے حضور کی چٹکی منجی ہوئی،
ملے ہیں جبکہ دونوں دل تو آخر شرم سے حاصل
مریض غم کو اپنے ہاتھ سے تم زہر ہی دیدو
قتل اور مجھ سے سخت جاں کا قتل،
دل میں پیوست ہے اک تیر نکالوں کیونکر
اے خائے دست قاتل دیکھ کر قسمت تری
کہیں وعدہ بھی کریں وہ کہ ذرا قرار آئے
ملنے کو تو میں حضرت ناصح سے ہاں ملا،
لیکن ہنسی بھی وقت ملاقات آگئی،

لیکن مندرجہ بالا اشعار سے یہ نہ سمجھا جائے کہ قدیم تغزل کیسرا اسی اساس پر قائم تھا۔ یہ ضرور ہے کہ پیش منظر کے خط و خال اکثر یہی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ عزیز کے کلام سے جو اشعار پیش کئے گئے ہیں وہ رنگ غالب کا درجہ نہیں رکھتے تاہم پس منظر (Back ground) میں افق کی سیاہی کی حیثیت ضرور رکھتے ہیں۔

ان سے زیادہ دلچسپ اور اہم وہ اشعار ہیں جو اپنی اصل و نسل کے اعتبار سے اسی شاخ کے برگ و بار ہیں جس کا ابھی ابھی ذکر کیا جا چکا ہے۔ لیکن عزیز نے ان میں وہ تراش و خراش پیش کی ہے جو اپنا نمونہ آپ ہے۔ چنانچہ اس منزل پر آکر محبوب اچھا خاصہ انسان اور انسانی جذبات کا حامل ہو جاتا ہے اور بجائے اپنے مریض غم کو تغافل بیجا کا شکار بنانے کے وہی سلوک کرتا ہے جو ایک ہمدرد دوست کو کرنا چاہئے۔

ان کی اس کوشش بید کا پتہ دیتا ہے چارہ سازوں کا مری لاش پہ گریاں ہونا
اس کے علاوہ زندگی میں عاشق کو پورا احساس تھا کہ اس کا محبوب پتھر کا ایک مجسمہ نہیں ہے۔ اس لئے اپنے معاملات میں احتیاط سے کام لیتا ہے۔

ڈرتا ہوں دل کا حال بیاں تم سے کیا کروں
محبوب عاشق کی موت کے بعد قبر پر جانے سے نہیں چڑھتا۔

یہ ہجوم اہل دل کا نہ سر مزار ہوتا
مری قبر پر وہ شاید کبھی آگئے ہیں ورنہ

رقیب ہمیشہ تکلیف دہ قوتوں کا مرکز سمجھا گیا۔ لیکن عزیز اسے بھی قدر۔ خوشگوار دشمنی میں پیش کرتے ہیں۔
 کہتے ہیں وہ رقیب سے افسانہ کلیم مجھ کو ہلاک حسرت دیدار دیکھ کر
 اسی طرح ناصح کو شاعروں کی بزم کا مسخرہ (Clown) تصور کیا جاتا تھا۔ عزیز اس مخلوق کو بھی متانت
 کا حقدار سمجھتے ہیں۔

ہے۔ رتا قدم سادہ لوحی کا نقشہ غنیمت زمانے میں ناصح کا دم ہے
 انگریزی میں ایک محاورہ ہے "To give the devil his due" عزیز نے نادانستہ
 طور پر یہی فرض ادا کیا ہے۔
 کاروبار محبت میں "وعدہ" کے زور پر کیا ہوائی قلعے نہیں بنتے۔ لیکن عزیز حقیقت کو سمجھ گئے اور وہ بھی
 کس انداز سے

ترے وعدہ کی حقیقت کو ہمیں سمجھ رہے ہیں وہ حرص زندگی ہے جسے اعتبار آئے
 بارگاہ حسن میں "شہادت" عاشقی کی معراج ہے۔ چنانچہ کوئی تعجب نہیں اگر سرکٹانے کے شوق میں مقتل میں بھی
 ایک عالم جمع ہو جائے۔ لیکن عزیز نے ایک "نفسیاتی" بات درمیان میں لا کر بات کو کچھ اور کر دیا ہے۔
 کہیں متصل میں کس سے یہ بھی شلیق شہادت ہوں یہاں سب خود غرض ہیں کون کس کے کام آتا ہے
 "یہاں سب خود غرض ہیں" کی داد نہیں دیا جاسکتی۔

پند و نصائح (Didacticism) بھی قدیم تغزل کی روایات میں ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں
 گو یہ چیز ہمیشہ تغزل سے خارج سمجھی گئی تاہم ہر اچھے اور برے شاعر نے غزل میں نفس کی ہوسناکی، سخت کلامی، بے ثباتی
 غیرت اور درپردہ کتبہ کے بے سود تنازعات پر اشارے کئے ہیں۔ عزیز نے یہاں بھی حق تقلید ادا کیا ہے لیکن یہ قلب پر
 کیا تقلید نہیں کہی جاسکتی۔ عزیز نے یہاں بھی ایک قسم کا نکہار پیدا کر دیا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ عزیز اس باب میں "ہمت و صلا"
 کی حد تک جدید معیار حاصل نہ کر سکے۔ احساس کی پستی لکھنؤ اسکول کے اس دور کی خصوصیت رہی ہے جو
 (Emotional Renaissance) جذبات نوازی سے وابستہ ہے۔ چنانچہ عزیز بھی
 ان دور سے باہر نہ آ سکے۔

پیدا و رہا بات کر کے تجھے روئیں دوسرے رونا خود اپنے حال پر یہ زار زار کیا
 اپنی ہی ذات میں خود اس کا نظارہ ہوتا ہجر میں ہم نے اگر نفس کو مارا ہوتا
 نازک دلوں کو سخت زباؤں سے ہے گریز شبنم کو کب قرار رہا نوک خار پر
 جاگنے سے فائدہ اے عابد شب زندہ دار کچھ نہیں ہے روح میں جب تک کہ بیداری نہیں

فرحت زلیت کم ہے کام بہت
ہوا استفادہ ہے یہی ہستی کا اقتضا
دیر و کعبہ میں فرق کیا ہے عزیز

لیکن جس حد تک بھی عزیز لکھنوی عزیز گوئی کے بگڑے ہوئے خط و خال کو سنوار سکے ہیں وہ ہر کسی کا کام نہیں صرف
ایک سلجھی ہوئی طبیعت، تربیت یافتہ دماغ اور ناقدانہ رجحان اس بار میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ عزیز کے ساتھ
جس منزل پر ہم یہاں پہنچے ہیں وہاں معلوم ہوتا ہے کہ مریض کو نزعی کیفیت کے بجائے وہ سکون خواب حاصل
ہے جس میں ہر سانس زندگی بنکر لوٹتی ہے۔

آئیے، عزیز کے کام سے آپ وہ نمونے منتخب کریں جو اگر قطعاً جدید رنگ کے حامل نہیں تاہم قدیم رنگ تفرول
کے خلاف کھلا ہوا اعلان جنگ ہیں۔

ہے ان کی بزم میں ہر شخص اپنے عالم میں
اک ان کا دل ہے کہ دم بھر ہنسی نہیں رکتی
ہاتھ بڑھنا تھا کہ رگ رگ میں، لہو دوڑ گیا
خود کشی سے بھی ہوئی کار بر آری نہ عزیز

اُس وقت عشق محو تھا اپنے ہی جلوے میں
کون ہے تیرے سوار روح روان ہستی،
فصل بہار تیری اللہ سے معنویت
اعتبار عشق نے لیکو نگا ہوں کو کیا

کچھ لوگ اجنبی سے رستہ بتا رہے ہیں
دو جہاں میں نہیں رہتا ہے ٹھکانہ جن کا
ہم ہیں اور بالیں پرستی ہم ہیں اور اعضا شل
میں حقیقت کو سمجھ کر تیری دیوانہ بننا

یہی اک پردہ تصویر بتانے کے قابل تھا
تمام روح کی لذت اسی پہ تھی موقوف
ابھی پیوست ہے کافر نگاہ شوخ ادا ان کی

اللہ! اللہ ذہنی ترقی وار تھا بھی کیا چیز ہے۔ دیکھئے ان اشداریں دنیا کا ہر قانون بدلا ہوا ہے۔ پہلے

کسی کا حال کسی پر عیاں نہیں ہوتا
اک اپنا حال کہ ضبطِ فغاں نہیں ہوتا
پھر وہی مرحلہ چاک گریباں نکلا،
سہل جو کام تھا وہ بھی تو آساں نکلا،

جب حسن خود نہ زینت بزم وجود سکتا،
تو نہ ہوتا تو بھلا کون ہوتا را ہذا
ذروں کا وہ نکھرنا، مٹی کا وہ مس نو دنا
وہ بھی حیراں ہوئے ہیں مجھ کو حیراں دیکھ کر

زندیاں سے میں چلا ہوں اُجڑے ہوئے دکان ہیں
ان امیروں کو وہ آزاد کیا کر بتے ہیں
اب وہ پہلی سی ہماری ستمی لاحاصل نہیں
یوں بھی عالم میں کسی کا راز داں کوئی نہ ہو

کہ آنسو گرتے ہی دامن پر عبور کچھ گئی دل کی
کہ زندگی میں کبھی تم سے گفتگو کر سکتے
کسی دن دیکھنا بجلی گراؤں کا اسی دل سے

حلقہ ہائے زلف میں تحریک دیوانگی تھی اب گل دلاری کی معنویت اس کی محرک ہے۔ پہلے شاعر زہر کی بھیک مانگتا تھا اب خود کشتی کا حوصلہ رکھتا ہے۔ پہلے لوگ سودائی تھے گوشت پوست کے ایک لوتھڑے کے۔ اب ان کی نظر ”روح روان عالم“ تک پہنچتی ہے۔ پہلے پتھر کے ٹکڑے آئینہ حیرت تھے، اب ”اعتبار عشق“ بھی ایک قوت بن گیا۔ پہلے لوگ دیوانہ بنتے تھے، قیس و فریاد کی جانشینی کے علمبردار بن کر لیکن اب دیوانہ بنتے ہیں اس لئے کہ رگ جاں پر کوئی نشتر زن ہو کر کہتا ہے کہ ”تم میرے دیوانے بنو!“ گویا یوں سمجھ لیجئے کہ پہلے شاعر کو واسطہ تھا جسم سے مگر اب فرح کی قوت بھی اسے محسوس ہونے لگی ہے۔ پہلے شاعر کی نگاہ محدود تھی صرف روزمرہ کی زندگی اور اس کے عمومی جزئیات پر لیکن اب اُس کی نظر زندگی کی حقیقتوں پر پڑھرتی ہے۔ پہلے شاعر اس دنیا کے تجربوں پر قانع تھا جسے خلوت و جلوت کی چہار دیواری کہا جاسکتا ہے لیکن اب ایک پوری کائنات اُس کی محفل ہے۔

کہا جاتا ہے عزیز کا یہ ذہنی ارتقا غالب کی تقلید کا مرہون منت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خاں کو درپردہ اسرار ہے کہ عزیز کو غالب کا صحیح مقلد اور مصنفیر مانا جائے۔ لیکن مجھے اس گمان میں حسن ظن کی جھلک نظر آتی ہے۔ اگر غالب کی تقلید کے یہ معنی ہیں کہ ہر بات کو ایک معمم بنا کر پیش کیا جائے تو عزیز ایک حد تک غالب کے مقلد کہے جاسکتے ہیں۔

جفائے ناز بتقریب رسمِ اُلفت ہے یہی ہے خیر ابھی امتحاں نہیں ہوتا
ہے بہم ترجیح سودائے مرہ پر ردِ وقارِ ہر گدل دے رہی ہے نوکِ نشتر کا جواب
سلسلہ جو ہر شمشیر کا بھتا مانعِ دید ہر نظر تھی مری پا بند سلاسلِ قاتل
مژگاں کو شعلِ ماتمِ ناکامی نگاہ آنکھیں جھپک رہی ہیں تری جلوہ زار میں
لیکن اس تقلید کی مثالیں استثناء کی حد تک کم ہیں۔ اب اگر غالب کی تقلید سے مراد ہے اس کے طرز بیان کی تقلید تو بھی یہ بات صحیح نہیں اترتی۔ غالب کا شعر ہے۔

رات اسکی ہے، دماغ اسکا ہے نیند اسکی ہے تیرمی زلفیں جس کے شانے پر پریشاں ہو گئیں
عزیز کے یہاں اس اسلوب بیان کی تقلید صرف دو جگہ نظر آتی ہے۔

خیال اٹکا ہے، آشفۃ سر می انکی جنون انکا جو دیوانے قریب دامن کو سار بیٹھے ہیں
انتظار اسکا خیال اسکا، امید اسکی نہ بوجھ صبح سے شام ترے در پہ جو کر دیتا ہے
ربا غالب کی تخیل اور اس کی تقایید کا سوال تو مجھے اس بات کی صحت میں بھی شبہ ہے۔

عرضِ مطلب بہ تمنائے سکونِ دل ہے وہ سنیں یا نہ سنیں ہم تو سنا جاتے ہیں
ابتک کچھ آشیاں کا سماں سا نظر میں ہے گو میں نفس میں تازہ گرفتار بھی نہیں

اس قسم کے اشعار عزیز کے یہاں بس دو چار ہی ہیں اور غالب کا یہ رنگ -

موت کا ایک دن معین ہے میند کیوں رات بھر نہیں آتی
سہلے آتی تھی حال دل پٹھسی، اب کسی بات پر نہیں آتی

تو کسی حد تک بھی عزیز کی قسمت نہ ہو سکا - غالب کا شعر ہے :-

کوئی دیرانی سی دیرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھریا د آیا

عزیز جس حد تک "گھریا د آنے" کی تخیل سے حاصل کر سکے ہیں وہ صرف یہ ہے
غمکہ اپنا کیا پھر دیراں پھر مجھے آپ کا گھریا د آیا

غالب کا ایک مشہور مقطع ہے :-

بنا کر فیروں کا ہم سبھیں غالب تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

غالب کا تیکھا پن عزیز سے پیدا نہ ہو سکا اور شعر سچ محض فقر کی صدا بن کر رہ گیا - سنئے :-

درِ منعم پہ ہے مقصود گدائی کس کو دل پر حوصلہ اہل کرم دیکھتے ہیں

غالب کی تخیل کو چھوڑئے - غالب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی زبان میں وہ صحت اور چستی ہے جو الفاظ کو آدھی شاعری بنا دیتی ہے - اس کے خلاف عزیز نے جہاں غالب کی زبان کی تقلید کی ہے وہیں صحت سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں -

بقدر جوش جوانی بڑھا غور ان کا کہے نے نشہ با اندازہ خمار کیا

گویا شب فراق میں سر سے تا قدم آئینہ تجل ایذائے درد دھتا

گرہ دل کی کھلی اک ناخن رنگیں سے خوں ہو کر ہمیں یہ طرزِ حل عقدہ مشکل پسند آیا

آنکھیں ہیں بند خواب جوانی میں مست ہیں پردہ کھنچا ہوا ہے حرمگاہ ناز کا،

مجھ کو اس صفحہ ہستی سے ہو کیا دلچسپی جس کو تصویر خیالات پریشاں سمجھا

تھی مری ہستی بھی جب اک قطرہ دریا نما کیوں نہ ہم آغوش کر کے پھر مجھے دریا کیا

ہاں اے حریم قدس میں ہنگام گرم کن، محفل کارنگ دیکھ رہے ہیں یہیں سے ہم

خیال ان کا ہے آشفته سری ان کی جنوں انکا جو دیوانے قریب دامن کھڑا رہ بیٹھے ہیں

وارفگان حسن پہ کیا جانے کیا بنے اٹھ جائیں گرنگاہ سے پردے حجاب کے

اڑتی ہوئی یہ خاک پریشان یہ ہوا تشریح ہے عزیز کے حال تباہ کی

مجھے مندرجہ بالا اشعار میں "نشہ با اندازہ خمار"، "ایذائے درد"، "طرزِ حل عقدہ مشکل"، "حرمگاہ ناز"، "تصویر

خیالات پریشاں، ”قطرہ دریا نا“ ”ہنگام گرم کن“ ”قرب دامن کہسار“ ”پردہ حجاب“ — ان تمام تراکیب کی صحت پر شک ہے۔ فیصلہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔

لیکن اس بحث کا مدعا یہ نہیں کہ میں عزیز کی حیثیت پر داغ لگانا چاہتا ہوں۔ بلکہ میرے نزدیک تو تقلید کا حامی ہونا اپنی انفرادی قوتوں اور اپنے فطری رجحانات کا خون کرنا ہے۔ اس طرح کسی شاعر کو غالب کا ہم نوا یا ہمرنگ مقلد کہہ دینا بھی کوئی امتیاز نہیں۔ عزیز، عزیز ہیں اس لئے کہ انہوں نے اپنا ایک انفرادی رنگ پیدا کیا نہ اس لئے کہ انہوں نے غالب کی تقلید کی۔ زبان و تخیل کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتیں۔ اور ظاہر ہے کہ نہ عزیز کی تخیل غالب کا اسلوب بیان قبول کر سکتی ہے اور نہ عزیز کا طرز کلام غالب کی تخیل کو جگہ دے سکتا ہے۔ غالب کے کلام میں ایک ”جرات مردانہ“ ہے عزیز کے کلام میں نسائیت کا لوہا ان کی شاعری کی بنیاد بنا ہوا ہے۔ پھر غالب عزیز کے یا عزیز غالب کے ہم صفت و ہم رنگ کیونکر ہو سکتے ہیں اور جب یہ بات حاصل نہیں تو عزیز کو غالب کا ہم نوا بنانا ایک سعی لاحاصل کے سوا کچھ نہیں۔ عزیز کے تخیل کی نوعیت اور ان کے اسلوب بیان کی گنجائش ظاہر کرنے کے لئے ان کے یہ شعر کافی سمجھتا ہوں :-

سہراک قدم ترے کوچے میں ایک عالم ہے
کہاں تک اب میں چلوں گا چلا نہیں جاتا
ہجوم شوق کا بس مختصر یہ قصہ ہے
کہ جو میں چاہتا ہوں وہ کہا نہیں جاتا
زبان دل کی حقیقت کو کیا بیاں کرتی
کسی کا حال کسی سے کہا نہیں جاتا
کہہ کے بیمار سے یہ سمجھ گئی شمع
رات ہوتی ہے یوں بسر دیکھو

اس اسلوب بیان سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے تخیل پر شکوہ الفاظ و تراکیب کی حامل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسکے خلاف عزیز نے اپنی سادگی میں وہ بناؤ پیدا کئے ہیں کہ جواب نہیں ہو سکتا۔ درجہ اول کی شاعری کا ایک یہ بھی معیار سمجھا جاتا ہے کہ شاعر الفاظ کے ذریعے ”مصور“ میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔ اس معیار پر عزیز صفت اول میں بھی نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ تصویریں بنائی ہیں۔ لیکن کمال یہ ہے کہ ذہن کے سامنے مکمل تصویر پیش نہیں کی جاتی بلکہ محض بعض ”خط“ اور ذہن فوراً ان خطوط سے مکمل تصویریں پیدا کر لیتا ہے۔ بالفاظ دیگر کہہ لیجئے کہ عزیز کے اصلی رنگ میں نسائیت (Feminine Grace) کے ساتھ ساتھ (Suggestibility) کا کافی حصہ ہے۔ اچھا تو اب کچھ مرقع دیکھئے :-

شیشہ دل کو یوں نہ اٹھاؤ
دیکھ کر ہر درو دیوار کو حیداں ہونا
دیکھو، ہاتھ سے چھوٹا ہوتا
وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا
اک اُن کا دل ہے کہ دم بھر ہنسی نہیں رکتی
اک اپنا حال کہ ضبطِ فغاں نہیں ہوتا

نظروں نے دیکھی شرم کی اک قدر تکی کشش
انگڑائی لیکے جب کوئی محفل میں رہ گیا
ہنس رہا ہے دیکھ کر یہ کون تجھ کو دید سے
سر اٹھا اے دل سے باتیں کرنے والے سر اٹھا
ارے کھلے ہوئے پھولوں کے توڑنے والے
چمن میں کوئی نہیں آشنائے دردِ بہار

یہ محاکات ہے اور حد درجہ نازک قسم کی بعض صاحب کمال مصوٰر پوری تصویر نہیں بناتے صرف آنکھوں کا زافہ یا پیشانی کی شکنیں یا ہاتھ کی انگلیاں بنا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور ان نقوش میں وہ صحت اور معنویت ہوتی ہو کہ دل و دماغ کسی اضافے کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتے۔ عزیز نے یہ مصوری الفاظ میں کی ہے اور یہ ان کے کمال کا ایک باوقار پہلو ہے جی چاہتا ہے کہ ہر خاکے میں رنگ بھر کر مکمل کیا جائے اور ایک کے نیچے لکھا جائے ”دیکھو ہاتھ سے چھوٹا ہوتا!“ دوسرے کے نیچے ”وہ مرا پہلے پہل داخل زنداں ہونا“ تیسرے کے نیچے ”دم بھر ہنسی نہیں رکتی“ چوتھے کے نیچے ”شرم کی اک قدر تکی کشش“ پانچویں کے نیچے ”سر اٹھا دل سے باتیں کرنے والے سر اٹھا“ اور آخری خاکے کے نیچے ”ارے کھلے ہوئے پھولوں کے توڑنے والے!“

لیکن یہ غلطی ہوگی اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ عزیز کا شاعرانہ کمال صرف اسلوب بیان کی لسانیئت اور مصورانہ نزاکت پر ختم ہو جاتا ہے۔ عہد حاضر کے ناقدوں نے تخیل کو مخصوص اہمیت دے رکھی ہے۔ کسی شاعر کا کلام سامنے آئے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ اس کی تخیلی قوتیں کس حد تک صحیح اور بلند ہیں۔ عزیز اس معیار پر بھی پورے آتے ہیں گے اور بڑی بات یہ ہے کہ انھوں نے کسی ایک جگہ بھی تخیل پرستی کے اصول سے مرعوب ہو کر اصل غزل سے اجتناب یا تغافل نہیں برتا ہے۔ چنانچہ ان کے چوٹی کے کلام میں تخیل کی بلندی اور صحت کے ساتھ غزل کے تمام مستحسن عناصر مثلاً حسن و عشق، ذوق و شوق، جذب و اضطراب بدرجہ کمال موجود ہیں اور ان خوبیوں میں نفسیاتی توازن نے اور چار چاند لگا دئے ہیں۔

اپنے مرکز کی طرف مایل بہ داز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
دیکھ کر نظم دو عالم مجھے کہنا ہی پڑا
یہ سلیقہ ہے کسے انجمن آرائی کا
دل کو جو نہی سکوت ہوا جسم سرد دھتا
وہ مدت حیات تھی جب تک کہ درد تھا
صرف اک خیال عشق تھا تکلیف وہ عزیز
تھا دل میں درد اور نہ کلیجے میں درد تھا
جان دی تو پھر ان کو درد آشنا پایا
روح ایک نالہ تھی آج اسے رسا پایا
شمعیں افسردہ جہاں، پھول ہیں پژمردہ جہاں
دل کو اس گور غریباں میں پکارا ہوتا
چمن پر اپنی طرف دیکھ کر وہ ہنستے ہیں
اب ان کے واسطے کہئے کہاں سے آئے بہار
اُس کی شام غم پہ صدقے ہو مری صبح حیات
جس کے ماتم میں تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

جو دی تھی حسن کو یہ دلفریبی
میں ہوا ہوس کے ساتھ نہ رکھوں گا قدر عشق
غم دوست کے لئے کوئی ہنگامہ چاہئے
ہے ضبط گریہ میرے لئے اک محال بات
زمانے کے حوادث خود مری فطرت میں داخل ہیں
اے حسن وقت مشق تصور تو دے ذرا

مندرجہ بالا اشعار نہ صرف عہد جدید کی غزل گوئی کا بلند ترین معیار پیش کرتے ہیں بلکہ مستقبل کی غزل گوئی کے لئے
سنگ بنیاد ہیں۔ یہاں ہر جذبہ نہ صرف سورج کی کرن کی طرح لطیف اور روشن ہو گیا ہے بلکہ ثقل (Prima) میں
نکھر کر قوس قزح کی رنگینیوں کا حامل ہو چلا ہے۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ عزیز کا یہی رنگ پختگی کے درجے
کو پہنچتا گیا ہے اور ہمارے لئے ان کے تغزل کا یہی پہلو طرہ امتیاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اچھے شعری ایک یہ
بھی پہچان ہے کہ اسے پڑھتے ہی یا سنتے ہی دل و دماغ میں ایک چمک سی پیدا ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ
وہ شعر حلقے میں پیوست ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ آپ ہزار بار کہیں گے کہ فلاں شعرا چھاپے لیکن آپ
اس پر الفاظ و تخیل سے متعلق کوئی بحث گوارا نہیں کر سکتے۔ یہی حال عزیز کے مندرجہ بالا اشعار کا ہے۔ یہ اشعار بہت
اچھے ہیں۔ آپ کہیں گے کیوں؟ میرا جواب ہے ”محسوس کر کے دیکھئے“

فضل الدین اشراکیم۔ اے

تاریخ اسلامی ہند مع توقیت

کتابی شکل میں

تاریخ اسلامی ہند جو نگار میں بڑا جزا جنوری تا دسمبر ۱۹۳۸ء شائع ہو چکی ہے اس کے کچھ فارم زاید چھپوائے گئے تھے
چنانچہ اب وہ کتابی شکل میں طیار ہے وہ اصحاب جو نگار کے خریدار ہیں لیکن فائل کے علاوہ تاریخ علیحدہ حاصل کرنا چاہتے
ہیں، دہلیز وہ اصحاب جو نگار کے خریدار نہیں ہیں اسے حاصل کر سکتے ہیں۔ کتاب مع توقیت ۴۴۴ صفحات پر مشتمل ہے
اور قیمت منہ محصول ۱۱/۱۱ ہے

مینجر نگار لکھنؤ

آئندہ جنگ میں کون کس کا ساتھ دے گا

جنگ ہونا لازم ہے اور وہ بھی مستقبل قریب میں اس سے انکار ممکن نہیں۔ جمعیت اقوامِ مردہ ہو چکی ہے، کیلاگ اور لوکارو کے معاہدے پرزے پرزے ہو چکے ہیں، جمہوریت آہستہ آہستہ آمریت کے مقابلہ میں جھٹکتی جا رہی ہے، اسلحہ سازی اور جنگ کی تیاری دیوانگی کی حد تک جاری ہے اور ہر ملک انتہائی خود غرضی کے ساتھ دوسرے ملک کا گلا گھونٹنے کے لئے تیار ہے۔

لوگ غلطی سے یہ سمجھ رہے ہیں کہ گزشتہ جنگ میں اتحادیوں کا جرمنی کے مقابلہ میں آنا صرف ایک ہمسایہ ملک بلجیم کی آزادی قائم رکھنے کے لئے تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ کا سبب محض تجارتی و بحری رقابت تھی اور مقصد مراکش میں جرمن درخور کسی طرح برطانیہ کو گوانا نہ تھا۔ بلجیم تو صرف بہانہ تھا ورنہ یوں بھی انگلستان فرانس کو جرمن کے مقابلہ میں مغلوب نہ دیکھ سکتا تھا اور اب بھی انگلستان کے یہ مصالح بدستور قائم ہیں، گو دوسرے حالات بہت کچھ بدل گئے ہیں۔

اس وقت جرمنی دیوانہ وار اس کوشش میں لگا ہوا ہے کہ اس کی آبادی جسمانی قوت میں ساری دنیا بڑھ جائے اور ساتھ ہی یہ کہ اس کی قوم ایک ممتاز جنگہ حاصل کرے۔ اٹلی اپنی دھینگا نشی سے اپنی کھوئی ہوئی قدیم عظمت کو واپس لینا چاہتا ہے، روس آہستہ آہستہ ایک اژدھے کی طرح آگے سرکتا جا رہا ہے، فرانس خاموشی کے ساتھ انتہائی حد تک اپنے کو مسلح کرتا جاتا ہے۔ انگلستان جو اپنی بحری قوت کے گھنڈے میں غافل سو رہا تھا دفعتاً چونک پڑا ہے تو حیران ہے کہ کیا کرے کیا نہ کرے اور اس کا احساس اول اول اس وقت ہوا جب حبشہ کے جھگڑے میں انگلستان نے دیکھا کہ مسولینی لندن پر گولہ باری کرنے کی حد تک آمادہ ہو گیا ہے۔ اس احساس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بھی اپنے آپ کو مسلح کرنے لگا اور ۲۰۰ ملین پونڈ سالانہ مدافعتیہ ترابری صرف کرنے کی منظوری دیدی۔ الغرض اس وقت یورپ کی حالت ایک ایسے میگزین کی سی ہے کہ ذرا سی چنگاری سے دھماکا پیدا ہو سکتا ہے۔ روس، جرمنی اور اٹلی میں ایک نئی نسل پیدا ہوئی ہے جس نے گزشتہ جنگ کی ہولناکیوں کو بھلا دیا ہے اور وہاں کے آرٹ، لطیفہ اور سائنس میں عسکری رجحان پایا جاتا ہے۔

ہر چند جرمنی عہد نامہ ورسائی کے پرزے پرزے کر چکا ہے، لیکن وہ اس پر قانع نہیں بلکہ گزشتہ جنگ میں جو ذلت اسے نصیب ہوئی ہے اس کا انتقام بھی لینا چاہتا ہے۔

انگلستان کی پالیسی گزشتہ جنگ کے بعد بہت کچھ مایل بہ امن ہو گئی تھی، بحری جہازوں کی تعمیر بھی کم کر دی گئی تھی، فوجی بھرتی بھی ختم ہو چکی تھی، وہاں کی آبادی نے بھی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کسی سے جنگ نہ کرے گی لیکن افسوس ہے کہ یہ سب کچھ خواب ثابت ہوا۔ جب تک جرمنی سیاسی، اقتصادی و عسکری حیثیت سے کمزور تھا اور اٹلی کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا، انگریز مزہ میں تھا، چین سے ڈر کھاتا تھا اور تمسکات کے بھاؤ کا مطالعہ کیا کرتا تھا، لیکن جب جرمنی نے اپنی فوجی قوت بڑھا کر وادمی رہائش پر قبضہ کر لیا اور اٹلی جنگ حبشہ کے دوران میں بحر روم پر چھا گیا تو انگلستان کے کان کھڑے ہوئے اور اس نے بھی اپنی بحری و ہوائی قوت کو بڑھانے کی فکریں شروع کر دیں اور ۵۰۰ ملین پونڈ کا صرف اس کے لئے تجویز کیا گیا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ اگر جنگ چھڑ گئی جو بالکل یقینی ہے تو کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس سے متاثر نہ ہو۔ لیکن سب سے زیادہ قابل توجہ یورپ کے وہ ممالک ہیں جن کے درمیان روم اور برلن کے اشتراک عمل نے خط فاصلہ کھینچ دیا ہے، مغرب کے تمام وہ ممالک جہاں اجتماعی یا جمہوری اثرات زیادہ پائے جاتے ہیں، یقیناً ہٹلر اور مسولینی کی آمریت کا مقابلہ کریں گے اور اگر روس نے بھی ساتھ دیا جو ایک حد تک یقینی ہے تو ہٹلر اور مسولینی کی مخالفت قوتوں کا پتہ بھاری ہو جائے گا۔

زیکو سلوویکیا پر جرمنی کے قبضہ نے فرانس کے سکون و اطمینان کو درہم برہم کر دیا ہے اور مفاہمت میونخ نے تو پوری طرح ثابت کر دیا کہ جرمنی کے مقابلہ میں آنے سے سب جھجکتے ہیں اور یہ جھجک زیادہ تر اس لئے ہے کہ انہوں نے کوئی قوم جنگ کے لئے اس قدر تیار نہیں ہے جتنی جرمن قوم۔

اب آس پاس کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں کو لیجئے تو ان میں سب سے زیادہ اہمیت پولینڈ کو حاصل ہے لیکن اس کی سیاست، خارجہ میں اس قدر جلد جلد انقلاب ہوئے ہیں کہ آئندہ کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہیں کی جاسکتی کچھ دنوں پہلے تک فرانس کا اثر وہاں قوی تھا، لیکن بعد کو جرمنی نے اس سے معاہدہ کر کے اپنے اثرات وہاں پیدا کر لئے۔ ہر چند پولینڈ کی نجات اسی میں ہے کہ وہ فرانس اور انگلستان کا ساتھ دے، لیکن روس کی طرف سے اسکی مددنی بہت بڑھی ہوئی ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ آخر میں جرمنی کا شریک ہو جائے۔

جو گوئیہ دیا میں بھی فرانس کے اثرات ختم ہو چکے ہیں اور اٹلی کے اثرات وہاں قائم ہو رہے ہیں اس لئے آئندہ جنگ میں وہ اٹلی کے خلاف تو لڑے گا نہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ بحرا ڈریا ملک میں اٹلی کے دشمنوں کے جہازوں کو نہ آنے دے۔

رومانیا، فرانس کا دیرینہ دوست ہے، لیکن حال ہی میں وہاں فاسسٹ جماعت نے زور پکڑ لیا ہے اور غالباً گوگا کی قیادت میں وہاں کی حکومت فاسسٹ جماعت کے ہاتھ میں چلی جاتی مگر اس کی موت نے ہوا کا رخ پھر بدل دیا ہے، لیکن اب بھی ہر وقت اس کا امکان ہے کہ گوگا کا آئرن گارڈ جو بہت ذی اثر ہے رومانیہ کو جرمنی کی آغوش میں ڈال دے۔ دوسری طرف انگریزوں کی طرف سے بھی رومانیہ کو تجارتی مدد پہنچ رہی ہے اور اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ آئندہ جنگ میں وہ کس کا ساتھ دے گا، تاہم ہٹلر کی نگاہیں اسکی معدنیات پر ڈول پر لگی ہوئی ہیں اور زیکو سلاویکیا کے حشر نے اسے بہت متروک کر رکھا ہے اور شاہ کرول کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کس کی اعانت پر بھروسہ کرے۔

بلغاریا ان ملکوں میں سے ہے جن کو گزشتہ جنگ عظیم میں سب سے زیادہ نقصان پہنچا تھا اور بلقان کی حکومتوں نے مستقلاً اسے غیر مسلح رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن شاہ بورس (جو شاہ اطالیہ کا داماد ہے) اٹلی کی مدد سے اپنے ملک کو پھر مسلح کر رہا ہے اور آئندہ جنگ میں وہ یقیناً اٹلی کا ساتھ دے گا اگر حالات نے اسے غیر جانبدار رہنے پر مجبور نہ کیا۔ حال ہی میں جرمنی سے بھی ایک تجارتی معاہدہ ہوا ہے جس نے جرمنی اثرات بھی وہاں پیدا کر دیے ہیں اور ان تمام حالات کو دیکھ کر کہا جاسکتا ہے کہ اگر اسے جرمنی و اٹلی کا ساتھ دینے سے یہ توقع قائم ہو گئی کہ جنگ عظیم کے بعد جو علاقہ اس سے چھین کر رومانیہ کو دیا گیا تھا، اسے پھر واپس مل جائے گا۔

ہنگری پر جرمن اثرات ظاہر ہیں کیونکہ اس کی اقتصادی فلاح جرمنی کے رحم و کرم پر موقوف ہے اور آئندہ جنگ میں اٹلی و جرمنی کا ساتھ دینا اس کے لئے ناگزیر ہے۔ اتاترک کے انتقال کے بعد ترکی کی آئندہ پالیسی کے متعلق کوئی صحیح رائے زنی کرنا مشکل تھا، کیونکہ اتاترک برطانیہ کی دوستی کو زیادہ عزیز رکھتا تھا اور ساتھ ہی ساتھ مجبوراً روس کے ساتھ بھی۔ شام کے مسئلہ میں ترکی کو فرانس سے ضرور مخالفت تھی اور ہے، لیکن برطانیہ کی وجہ سے وہ بروئے کار نہ آسکتی تھی۔

ترکی کو اپنا طرفدار بنانے کے لئے اگر برطانیہ نے سولہ ملین پونڈ کا قرض اسے دیا تو جرمن نے بھی ساڑھے بارہ ملین پونڈ دئے، لیکن پلہ برطانیہ ہی کا بھاری رہا اور عصمت پاشا نے باوجود اس کے کہ وہ انگریزوں کو پسند نہیں کرتا مصلحتاً انگریزوں ہی کا ساتھ دیا جیسا کہ حال کے ترکی انگریزی معاہدہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ یونان کی پالیسی بہت مشتبہ ہے۔ ایک طرف وہاں انگریزوں کا بھی کافی اثر ہے اور دوسری طرف وہاں کا وزیر اعظم فاسسٹ اصول پر حکومت کو چلانا چاہتا ہے۔

اسپین پر چونکہ جنرل فرانکو قابض ہو گیا ہے اس لئے نازی اور فاسسٹ اثرات وہاں کھلم کھلا موجود ہیں اور آئندہ جنگ میں انھیں کا ساتھ دینا اس کے لئے ناگزیر ہے، پر تنگال ہر چند اشتراکیت کا مخالف ہے

لیکن برطانیہ کے اثرات وہاں زیادہ ہیں اور دونوں میں فوجی اتحاد کا معاہدہ بھی ہو چکا ہے۔
اب ایشیا کو لیجئے تو معاوم ہو گا کہ عراق میں انگریزوں کی مخالفت بڑھتی جا رہی ہے اور ایران، برطانیہ کی
اُن زیادتیوں کو کبھی نہیں بھول سکتا جو پٹرول کمپنی کے سلسلہ میں اس نے ایران پر روا رکھی ہیں، افغانستان کے
تعلقات برطانیہ سے بہت زیادہ دوستانہ نہیں ہیں اس لئے غیر عربی مسلم حکومتیں کبھی برطانیہ اور روس کا
ساتھ نہ دیں گی بلکہ غیر جانبدار رہیں گی۔ رگبی عربوں کی حکومتیں سوان میں سے اکثر فرانس و برطانیہ سے نفرت
کرتی ہیں جس کا ثبوت فلسطین، عراق اور شام کی یحییوں سے ملتا ہے۔

جنوری سنہ ۱۹۳۹ء کا "نگار"

نظیر اکبر آبادی نمبر ہوگا

جن عنوانات پر مقالے درکار ہیں ان کی مختصر فہرست اس سے قبل کی اشاعت میں دی جا چکی ہے۔ وہ اہل قلم
قلم جو نظیر اکبر آبادی سے دلچسپی رکھتے ہیں انہیں اس میں حصہ لینے کی دعوت دی جاتی ہے۔
اس وقت تک حسب ذیل عنوانات تقسیم ہو چکے ہیں:-

نظیر و کبیر	=	پروفیسر فراق گورکھپوری ام۔ اے
نظیر اور اردو شاعری میں واقعیت و جمہوریت کا آغاز	=	پروفیسر مجنوں گورکھپوری ام۔ اے
نظیر تذکرہ نویسوں کی نظر میں	=	مولوی امیر احمد صاحب علوی بی۔ اے
نظیر کا مذہبی مسلک	=	ل۔ احمد اکبر آبادی
نظیر کی ہندو و انہ نظمیں	=	ڈاکٹر لکشمی دت صاحب
نظیر کے تلامذہ اور ہم عصر اساتذہ	=	جناب مفتی انتظام علی صاحب اکبر آبادی
نظیر کے لسانی اختراعات و ادبی احسانات	=	مولانا عبدالباری آسی
نظیر کا فلسفہ زندگی و نظریہ اخلاق	=	جناب مخمور اکبر آبادی بی۔ اے
نظیر کی خصوصیات لسانی	=	جناب مولانا سیام اکبر آبادی

عنوانات مقرر نہیں ہیں، ہر شخص اپنے لئے علاوہ عنوان تجویز کر سکتا ہے۔ اکتوبر تک مقالات کا پہنچ جانا ضروری ہے۔ نیاز

عدالت

گرم بازار فوجداری ہے

حکومتوں میں فوجداری، ریاستوں میں فوجداری، تعلیم گاہوں میں فوجداری، کارخانوں میں فوجداری، تیویاروں میں فوجداری، مسجد و مندر میں فوجداری، اردو و ہندی میں فوجداری — یہاں فوجداری، وہاں فوجداری۔ — اور کہیں کہیں خدائی فوجداری!

لات کئے چل رہے ہیں، لاٹھیاں چل رہی ہیں، گولیاں چل رہی ہیں، تلواریں چل رہی ہیں، قلم چل رہا ہے، زبان چل رہی ہے، دماغ چل رہا ہے، جوتے چل رہے ہیں — کہیں کہیں سے پیٹ چلنے کی بھی خبر آ جاتی ہے۔ ان سب سے نیٹنے کے لئے عدالتیں، لکڑخانے شفاخانے اور چنڈے کی فہرستیں کھلی ہوئی ہیں! غالب کے زمانہ میں فوجداری کے مقدمات عدالت ناز میں پیش ہوتے تھے۔ جیسا کہ آپ کو یاد ہوگا۔

پھر کھلا ہے در عدالت ناز گرم بازار فوجداری ہے

لیکن جن فوجداریوں کا میں نے تذکرہ کیا ہے وہاں شاعری کا دخل نہیں ہے۔ تعزیرات ہند و ضابطہ دیوانی کی کارفرمائی ہے۔ عدالت ناز کے بجائے فوجداری اور دیوانی کی عدالتیں ہیں۔ فوجداری اور دیوانی ہی کی نہیں فوجی عدالتیں بھی۔ قومی عدالتیں، مذہبی عدالتیں، تجارتی عدالتیں، اخباری عدالتیں — جا بجا اندھا دھند عدالتیں بھی ان میں کہیں فریقین مقدمہ ہیں، حاکم نہیں ہے۔ دکلار ہیں فریقین مقدمہ نہیں، حاکم ہیں قوانین نہیں — ایسی بھی ہیں جہاں سزائیں ہیں اور کچھ نہیں! آج کی گفتگو میں عدالت کا مسئلہ زیر نظر ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ کس قسم کی عدالت پر گفتگو کی جائے آپ تو جانتے ہیں کہ جب کوئی معاملہ عدالت کے سامنے ہوتا ہے، اس وقت نفس معاملہ پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ سمجھدار لوگ بہت تامل کرتے ہیں اس لئے کہ اکثر کوئی نہ کوئی بات زبان سے ایسی نکل جاتی ہے۔ جس سے آدمی تو بین عدالت کے جرم میں پکڑا جاتا ہے۔ پھر آج جب خود عدالت ہی پر براہ راست گھٹاؤ ہونے والی ہے تو ظاہر ہے کہ ایک صاحب فہم ہونے کی حیثیت سے مجھ پر کتنی کتنی ذمہ داریاں عاید ہوتی ہوں گی۔

لیکن ایک بات ضرور قابل اطمینان تو نہیں، قابل لحاظ ضرور ہے۔ اور وہ یہ کہ بعض ہستیاں ایسی بھی ہیں جن کا عدالت کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔ لیکن وہ چاہیں تو سب کچھ بگاڑ دیں یعنی ظل اللہ ان میں یقیناً نہیں ہوں۔ ممکن ہے آپ ہوں۔ بادشاہ پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ ہم آپ بادشاہ کے سایہ میں ہیں۔ اس لئے ہم آپ کا خدا ہی حافظ ہے! دوسری بات قابل لحاظ یہ ہے کہ عدالت کی زد میں عاقل و بالغ ہی آتے ہیں۔ اب آپ دیکھ لیجئے اگر یہ صفات آپ میں نہیں ہیں تو آپ بھی عدالت سے پناہ میں ہیں اور بقیہ ہم سب آپ سے پناہ خواہ ہیں۔ پاگل اور نابالغ کو عدالت کے سپرد نہیں کرتے۔ اسے پاگل خانہ یا تعلیم گاہ میں بھیج دیتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ پاگل خانہ پہنچنے پر حواس میں آجانے کا بھی امکان ہے۔ تعلیم گاہوں میں امتحانات اور اسٹراٹیک کی زد میں رہے رہے حواس بھی زایل ہو جاتے ہیں۔

عدالت کے سلسلہ میں پاگلوں کے رتبہ سے تو آپ واقف ہو ہی گئے۔ اب میں ایک اور بزرگ کا آپ سے تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ یعنی سرکاری گواہ، یہ جتنے زیادہ قابل گردن زدنی ہوں گے اتنے ہی زیادہ عدالت کے مراعات خصوصی کے سزاوار انھیں کے باب میں کہا گیا ہے۔

زند کے زند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

ریڈیو سرکاری چیز ہے اور میں ریڈیو کا آوردہ ہوں۔ آپ کسی سلسلہ میں نہیں آتے۔ زبان اور محاورہ کا بیچ نہ ہوتا تو میں یہ کہنے کے بجائے کہ آپ کسی سلسلہ میں نہیں آتے یہ کہتا کہ آپ کس شما۔ و قطار میں۔ بہر حال اگر آجکی عدالت گفتاری میں، شیطان کے کان بہرے، کوئی نوع دیگر ہو، تو آپ یقین مانے میں فی الفور سرکاری گواہ بننے کی درخواست کر دوں گا۔ شیطان کے کان بہرے کہنے کو تو میں کہہ گیا۔ لیکن اگر کوئی صاحب یہ خیال کرتے ہوں کہ میں نے شیطان کے ساتھ زیادتی کی۔ تو میں ان سے معافی مانگتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ عدالت میں میرا سابقہ شیطان یا اسکے کسی دوست سے ہو! عدالتوں میں فرشتوں کی یوں ہی کیا کی ہوتی ہے کہ میں ان بزرگ کو دعوت عدالت آزمائی دوں! ”سرکاری گواہ“ بننے کے جو حقوق مجھے حاصل تھے ان کا میں نے تذکرہ کر دیا ہے۔ لیکن یہ اندیشہ ضرور ہو کہ ریڈیو والوں کو سرکاری گواہ بننے کا زیادہ حق پہنچتا ہے۔ کیونکہ وہ مجھ سے آپ سے کہیں زیادہ سرکاری واقع ہوئے ہیں۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اوروں کے مقابلہ میں ان کو سرکاری گواہ بننے کا حق شفع حاصل ہے۔ بہر حال موقع آنے پر دیکھا جائے گا۔ کیا معلوم اونٹ یا عدالت کس کل بیٹھے!

اس کے ساتھ ایک اور دشواری بھی مد نظر ہے کسی بھلے مانس کے ساتھ کپڑے جانے سے مطلب یہ کہ ماخوذ ہوئے (اور ہندوستانی میں ہر لفظ یا فقرے کے ساتھ توضیحی عبارتوں کا دم چھلار دار رکھا گیا ہے) تو عدالت کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ مطلب یہ کہ جس دروازہ سے چاہے داخل ہو جائے اور جس گھر کی یا روشندان

سے چاہئے نکل جائے اور بالفرض نکل بھی نہ پائے جو تاہم درست کچھ ہی قیام میں بھی کوئی مفدا لائقہ نہیں۔ لیکن جب عدالت خود فریق مقدمہ ہو تو اس کے دروازے اکثر بند ہو جاتے ہیں۔ بند ہونے سے یہ مراد ہے کہ عدالت کے بند کمرہ میں آپ کا قانونی معائنہ کیا جائے گا! اس ضروری اعلان و اعتراف کے بعد مجھے نفس مضمون پر بے تکان گفتگو کرنے میں کوئی تامل نہیں۔

سب سے پہلے اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ قانون کا سارا کھیل طاقت کا ہے، چاہے وہ طاقت حرب و ضرب کی ہو، چاہے اخلاق و مذہب کی۔ اصولاً ہر حکومت اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ بات منوانے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کر دے گی۔ اگر ہر شخص کو اس امر کا احساس نہ ہو کہ اس کے ادنیٰ سے ادنیٰ جرم کی باز پرس میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور شدید سے شدید قوتیں برسر کار آ سکتی ہیں تو زندگی کا شیرازہ جلد سے جلد ہر ہم ہو جائے۔

عدالتیں، کیوں اور کیونکر قائم ہوئیں۔ اس کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ اور طول طویل بھی، جب سے دنیا میں لوگوں نے مل جل کر رہنا سہنا شروع کیا اسی وقت سے قانون کا بھی دور دورہ ہوا، جس نے مختلف زبانوں اور مختلف اقوام و ممالک میں مختلف صورتیں اختیار کیں اور اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ قانون سے ہمارا، رواں رواں جکڑا ہوا ہے۔ ہم قانون سے باہر نہیں ہو سکتے۔ کوئی "م قانون کی مدد بغیر قانون سے سرتابی کر کے نہیں کر سکتے۔ قانون بھی دو ایک نہیں، ان گنت ہیں۔ ان میں سے بعضوں کو ہم جانتے ہیں بہتوں کو نہیں جانتے۔ کتنوں کا لحاظ کرتے ہیں، کتنوں سے روگردانی کرتے ہیں۔ کبھی کبھار جاتے ہیں۔ پھر یہی نہیں۔ بہت سے قوانین ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے خلاف پڑتے ہیں۔ ہمارا قانون دوسروں کے قانون سے ٹکراتا ہے۔ اسی لئے اکثر ہمارا سر بھی دوسرے کے سر سے ٹکرا جاتا ہے۔ جس کی مرہم پٹی ہسپتال میں اور کبھی کبھی تجہیز و تکفین گورستان میں ہوتی ہے۔ ہماری تمام زندگی معلوم و نامعلوم معقول و نامعقول قوانین سے جکڑی ہوئی ہے جس سے صرف موت کا قانون آزاد ہی لاتا ہو وہ بھی کیا معلوم! ہاں تو قوانین ان گنت ہیں۔ مذہب کا قانون اخلاق کا قانون، فطرت کا قانون، حکومت کا قانون، فطرت کا قانون معاشرت کا قانون، جماعت کا قانون، اداروں کا قانون، اسی طرح خاندان، دولت، افلاس کا قانون، نوجوانوں کا قانون، بوڑھوں کا قانون، غرض زندگی کی کڑی جتنے تانے بانے بنتی رہتی ہے ان سب کے قوانین علیحدہ ہیں اور علیحدہ علیحدہ لائیں بھی۔ اس بھول بھلیاں سے جو شخص سب سے زیادہ کامیابی کے ساتھ باہر نکل آئے اسی کو ہم سب سے بڑا آدمی کہتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ بات یہی یاد رکھنے کی ہے کہ اکثر ایک قانون کی پابندی اسی حد تک کی جاتی ہے جس حد تک وہ کسی دوسرے بہتر قانون سے نہ ٹکرائے۔ انسان کسی ایسے قانون کا پابند نہیں رہ سکتا۔ جو اس کی مختلف حالتوں یا ضرورتوں کا لحاظ نہ رکھتا ہو۔ انسان میں غصہ، لالچ، خوف، شہوت، گھمنڈ، خود غرضی کی صلاحیتیں موجود ہیں جو موقع موقع سے ضرور ابھرتی رہتی ہیں۔ انھیں کوہموار رکھنے کے لئے قانون کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ اس لئے

قانون کو کسی نہ کسی حد تک لچکیلا ہونا چاہئے۔

میں یہاں قانون کی ماہیت نفس سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اچھا قانون وہی ہے جو انسانی مقتضیات کا لحاظ رکھتا ہو انھیں مقتضیات کی روشنی میں قانون کی تعبیر کی جانی چاہئے۔ اچھی دوا وہ ہے جو انسانی اعضا اور انسانی گوشت پوست سے میل کھا سکے اور اچھا طبیب وہ ہے جو مریض کی مخصوص طبیعت اور ترکیب جسمانی کے مناسب حال دوا تجویز کر سکے۔ میں ایسے علاج یا معالج کا قائل نہیں ہوں جس کے ہاں مرض اور مریض دونوں پر پہل لگے ہوں اور وہ آنکھ بند کر کے دونوں کو یکجا کر دیتا ہو۔ ٹھیک اسی طرح کی نسبت قانون اور عدالت میں ہونی چاہئے بذاتہ میں سمجھتا ہوں کہ کسی دو جرم مجرم کی نوعیت یکساں نہیں ہوتی۔ اس لئے قانون کو بھی اسی طور پر تولنا پڑنا چاہئے کہ وہ تولے اور پرکھے۔ مجرم پر عاید کیا جاسکے۔ عدالتوں کا یہی کام ہے اور میرا خیال ہے کہ نظائر اسی طریقہ کار کے نتائج ہیں۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ ہماری عدالتوں میں جرم کی نوعیت پر اتنا غور نہیں کیا جاتا، جتنا کہ قانون کی بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ ہم قانون پر زیادہ طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ملزم کی مخصوص نفسیات یا واقعہ کی مخصوص نوعیت پر بہت کم توجہ کرتے ہیں۔

”تمدن“ کی ترقی نے دنیا کے کاروبار اتنے بڑھا دئے ہیں اور اس طور پر الجھا دئے ہیں کہ ہم ان پر غور کرنے کے بجائے ان کو جلد سے جلد کسی نہ کسی طرح طے کر دینے کے زیادہ کوشاں رہنے لگے ہیں۔ عدالتوں میں مقدمات کے فیصل کرنے میں اتنی احتیاط نہیں برتی جاتی جتنا کام ختم کر دینے کی کوشش کی جاتی ہے ہمارے حاکم اور ہماری عدالتیں اکثر یہ فرض کر لیتی ہیں کہ قانون اس قسم کی مشین ہے جو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دکھاتی ہے بہت سی ایسی چیزیں ہیں جہاں مشین کی کار فرمائی مفید ہوتی ہے۔ لیکن عدالت اور تعلیم گا ہوں کو مشین پر داختہ یا مشین آشنا کرنا بڑی غلطی ہے۔ ایک مشین لاکھوں آدمیوں کو ہلاک کر سکتی ہے۔ لیکن لاکھوں مشین ایک آدمی کو سنوار یا سدھا نہیں سکتی۔ آدمی کو تو آدمی ہی چاہئے۔

آپ تو جانتے ہیں اس وقت ہماری گفتگو قانونی عدالتوں سے ہے ورنہ دنیا میں معلوم نہیں کتنی عدالتیں ہیں، یہی نہیں بلکہ بعض قوانین ایسے ہیں جن کے لئے کوئی عدالت نہیں۔ طبیعیات ہی کے قانون کو لے لیجئے۔ یہ قانون ہمارے آپ کے رونے دھونے، مارنے مرنے اور اس قسم کی ساری خرافاتوں سے آزاد ہے۔ سورج چمکے گا ستارے ٹٹھکیں گے۔ گرمی سے چیزیں بڑھیں گی۔ سردی سے سکڑیں گی۔ روزی میسر ہوتی ہو بھوک لگے گی۔ ایسے اور قوانین ہیں جن کے ماتحت نفع نقصان رنج راحت کی دھندے چلتے رہیں گے۔ ان کی لیپ پوت ممکن ہے ان سے چھٹکارا ناممکن ہے۔

”قانون کی تاریخ“ بڑی دلچسپ ہے غور تو کیجئے جب دنیا پہلے پہل آباد ہوئی ہوگی اس وقت کے قانون کیا

ہوں گے اور اب جبکہ دنیا کی آبادی کی کوئی حد نہیں، اس کے قوانین کیا ہیں۔ کچھ اور نہیں تو اسی پر غور فرمائیے کہ پہلے آبادی بڑھانے کے اصول بڑھتے جاتے تھے اور اب آبادی گھٹانے کے لئے کیسے کیسے اسلحات کام میں لائے جاتے ہیں یا اعتباری حالات دی۔ پی ہوتے رہتے ہیں پہلے انسان فطرت کا غلام تھا، اب فطرت کو اپنا غلام بنانے کی فکر میں ہے، پہلے پیٹ بھرنے کے لئے شکار کرتا تھا، اب اقتدار بڑھانے کے لئے جنگ کرتا ہے پہلے طاقت کا نام قانون تھا، اب قانون کا نام طاقت بتاتے ہیں۔

یہ سب کچھ ہے لیکن بات جہاں کی تہاں ہے طاقت کی کار فرمائی پہلے بھی تھی اب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے جو کام پتیرے سے لیتے تھے اب وہی کام آداب تسلیمات سے لیتے ہیں۔ پہلے جس واقعہ کا اظہار ”جس کی لاٹھی اس کی بھنیس“ ایسے بھدے جملے یا محاورہ سے ہوتا تھا، وہی اب شاد کے شعر سے ہوتا ہے۔

یہ بزم ہے یاں کوتاہ دستی میں ہو محرومی جو بڑھکر خود اٹھائے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے لیکن جس طرح قانون اور عدالت کی زد میں محض مقدمات کا دوران بڑھتا رہتا ہے اور فیصلہ کی نوبت اس وقت آتی ہے، جب فریقین مقدمہ کا بجائے خود فیصلہ ہو چکا ہوتا ہے، اسی طرح آج کی تقریر میں محض قانون عدالت کا دوران بڑھتا رہا اور خلاصہ فریاد کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے میں تمہید کو چھوڑ اصل مقدمہ کی طرف رجوع کرتا ہوں میرا عدالتوں سے تعلق رہا ہے ”ہسپتال“ میں بھی مدتوں رہا۔ اس لئے آپ کو تعجب نہ ہونا چاہئے۔ یونیورسٹی میں کیوں ہوں۔ لیکن اس سے آپ یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکال سکتے کہ میرا عدالت سے متعلق ہونا ہسپتال جانے کا باعث ہوا۔ جو عدالت کی زد میں آ جاتا ہے اسے ہسپتال اور یونیورسٹی دونوں سے بہتر مقام پر بھیجتے ہیں۔

میں نے پنج مجسٹریٹوں کے وہ زمانے بھی دیکھے جب نہ مجسٹریٹ قانون جانتے تھے اور نہ عورتیں سپاٹک مختار وکیلوں کے پاس لپٹتی بستے اور مانگے کی عنکیں ہوتی تھیں جب بائیسکیں صرف کپتان قسم کے لوگوں کے پاس ہوتی تھیں اور وہ کہیں معائنہ کو آتے تھے تو تھانہ دار صاحب ان کی بائیسکل کے پاس اس طور پر کھڑے ہوتے تھے جیسے کوئی نیاز مند دہاتی کسی شریہ اور منہ زور گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے جھکا سمٹا اس طور پر لھڑا ہوتا ہے کہ گھوڑا ذرا چمکا اور یہ باگ چھوڑ کر بھاگا۔

اسی زمانہ کے ایک سن رسیدہ پنج مجسٹریٹ صاحب کا تذکرہ ہے جو ایک آنکھ دو ایک حواس اور دونوں پاؤں سے مغدور تھے۔ معدہ کے مریض اور بننے کے مقروض تھے۔ ڈاک ہنگلہ میں اجلاس ہوتا۔ جہاں ایک قبہ دار بالکی پر لاد پھاند کر پہنچائے جاتے۔ بالکی ایسی تھی جن کی چار گھنٹے پہلے سے مرمت شروع ہوتی تو دو گھنٹہ کے لئے کام دیجاتی مدعی مدعا علیہ اور ان کے حوالی موالی کہار کا کام دیتے۔ مختار وکیل صاحبان جلو میں چلتے۔ مجسٹریٹ صاحب بھاری بھر کم آدمی تھے اور بیگھوں میں سماتے تھے۔ کسی قسم کا شعور باقی نہیں رہا تھا۔ اس لئے وزراء

میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ بیٹھے تو پالکی کے بیچ ہی میں تھے لیکن جدھر مدعا علیہ ہوتا اسی طرف تکیہ کے سہارے لیٹ جاتے۔ اس طور پر دور سے دیکھنے والے فوراً سمجھ جاتے کہ فریقین میں مدعی کون ہے اور مدعا علیہ کون۔ کچھ حاکم کا وزن کچھ زمین کی کشش کچھ پالکی کی بوسیدہ سیٹ، نتیجہ یہ ہوتا کہ مجسٹریٹ صاحب کا کوٹھوں سے اوپر تک کا بہت کچھ حصہ ایک گٹھری کی صورت میں پالکی کی پٹی سے نیچے نظر آتا یہاں تک کہ آپ آسانی سے دیکھ سکتے تھے کہ پالکی کی سیٹ کس طرح مستحکم بنانے کے لئے کون کون چیزوں سے مدد لی گئی تھی مثلاً انگوچھا، نواڑ، ادوائن کی رسی، برگد کے پتلے گدتے دور سے پالکی ایسی نظر آتی تھی جیسے کسی قبر دار مزار کا عکس پانی میں اڑ رہا ہے۔ بچپان کا ایک سر حاکم کے منہ میں ہوتا اور بقیہ متعلقان مقدمہ کے پاس۔ ڈاک بنگلہ دور تھا۔ حقہ پیتے خواب دیکھتے، وکلاء کی بحث سنتے چلے جاتے اور کچھری پہنچتے پہنچتے مقدمہ کا فیصلہ سنا دیتے۔ واپسی میں اس کی اپیل بھی سن لیتے اور حسب مصلحت کبھی فیصلہ بحال رکھتے اور کبھی مسترد کر دیتے۔

لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے واقعے آپ کو سنانا شروع کر دوں تو ممکن ہے آپ کی دلچسپی بڑھ جائے مگر میرا خطرہ میں مبتلا ہو جانا۔ یقینی ہے۔ امکان کو یقین پر ترجیح دینا بڑی ”غیر عدالتی“ بات ہے اس لئے میں اس سے پرہیز کرتا ہوں۔ آج کل کی عدالتوں کی مثال آج ہی کل کے ڈاکٹروں یا مزاروں سے دیجا سکتی ہے۔ جس طرح آپ کسی مزار پر جائیں تو قدم قدم پر مجاور اور دربان آپ سے کچھ نہ کچھ ”چراغی“ وصول کرتے جائیں گے اور وقتاً فوقتاً دعائیں اور گالیاں بھی دیتے جائیں گے یہاں تک کہ آپ کی جیب خالی اور حواس مختل ہو جائیں گے یا جس طرح ڈاکٹروں سے سابقہ ہو تو تمام اعضاء، ریکسہ، درزیہ کا امتحان یا ان میں سے بعضوں کی قطع برید یا قلع قمع کراتے کراتے آپ دیوالیہ ہو جائیں گے یا ازکار رفتہ اسی طرح عدالتوں میں بھی چپراسی، کلرک اور وکلاء کی دار و گیر سے فریقین مقدمہ، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

مقدمات کی مثال بعض ایسے امراض سے دیجا سکتی ہے جن کا علاج بڑا قیمتی اور انجام ہمیشہ افسوسناک ہوتا ہے۔ وکلاء اور حکام دونوں واقعات سے اتنا سروکار نہیں رکھتے جتنا کہ دفعات سے بڑی سے بڑی اور آخری سے آخری عدالت تک صرف قانونی موثر گائی ہوتی ہے اس طور پر فریقین مقدمہ کی دادرسی ہوتی ہو یا نہیں قانون کو تعبیر و تاویل کی چرخ دے دے کر تصوف یقیناً بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ اب فی نفسہ عدالت، عدالت کا کام واقعہ کی تول پر کھ نہیں بلکہ دفعات قانون کی تول پر کھ رہ گیا ہے۔ ہم فریقین مقدمہ کے ساتھ انصاف نہیں بلکہ دفعات قانون کے ساتھ تصوف آزمائی کرتے ہیں اور بالکل ایسا ہے جیسے مریض کی جان بچانے یا تکلیف دور کرنے کے بجائے طبیب، متحقق مرض پر پوری کوشش صرف کر دے جس طرح ریاضیات، ایسا نیا تلامذہ بھی ترقی کی آخری منزلوں تک پہنچ کر صرف تصوف بن کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح عدالتوں کا کام دادرسی کے بجائے

قانون آزمائی رہ گیا ہے۔

چپراسی، محرر، وکیل، داکم، فریقین مقدمہ، بیانات، جرح، بحث، سمن، وارنٹ، دوران مقدمہ، ان سب کی ترکیب استعمال تا ترتیب انجام مستقل عنوانات ہیں جن پر اس مختصر عرصہ میں اظہار خیال ناممکن ہے۔ آخر آخر میں آپ اتنا اہل سمجھ لیجئے کہ سزا اور قانون کے دو بنیادی اصول یہ ہیں۔ یعنی جو بات کہی جائے اُسے کوئی نہ مانے یا جو بات منع کی جائے اُسے کوئی کر گزرے انھیں اصول کے ماتحت شیطان ماندہ درگاہ ہوا اور حضرت آدم جنت سے نکالے گئے۔ عدالت کا کام یہ ہے کہ وہ قانون کے اسی دو پہیہ کی گاڑی کو ٹڑھکاتی رہے اسی گاڑی پر دنیا کے سارے کھیل کھلونے لدے ہوئے ہیں اور گاڑی نامعلوم منزل کی طرف چلی جا رہی ہے۔ گاڑی بان کا فرض راستہ کے نیچے اونچے دیکھتے ہوئے گاڑی کو ہانکتے رہنا ہے۔ گاڑی کہاں جائے گی گاڑی کے پہیہ کیسے ہیں گاڑی کی ساخت کیا ہے، راستہ کی دشواریوں سے گاڑی کو کیونکر گزارا جائے گا۔ ان تمام باتوں کی ذمہ داری قانون بنانے والے اور منزل کے متعین کرنے پر ہے۔ گاڑی بان کو ان باتوں سے سروکار نہیں۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ گاڑی کے پہیے اور اس کے متعلقات کاٹ کباڑ کی ہوتی ہیں لیکن اس میں طاقت اسٹیم یا بجلی یا منہ زور جانور کی پہونچا دی جاتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی حالت میں گاڑی پہلے ہی دھچکے میں پاش پاش ہو جائے گی۔ کبھی انجن کو اسٹیم یا بجلی کے بجائے بیل، گدھوں سے کھینچنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ بیل گدھے تھک کر تباہ ہو جاتے ہیں اور انجن جہاں کا تہاں رہ جاتا ہے۔ کبھی کبھی ہوائی جہاز اور اسٹیم انجن کے چلانے والے کو چھکڑا اور ہینسی ہانکنے پر آمادہ کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورت میں کس کا کیا انجام ہوگا۔

رشید احمد صدیقی

مطلوب ہیں

نگار جنوری ۱۳۵۷ء۔ نومبر ۱۳۳۳ء۔ جنوری و اپریل
ستمبر۔ نومبر و دسمبر ۱۳۳۳ء۔ جون ۱۳۳۵ء۔ مئی و
اگست ۱۳۳۶ء۔ فروری۔ دسمبر ۱۳۳۷ء کے نگار کے
پرچے جو صاحب علیحدہ کرنا چاہیں۔ دفتر کو اطلاع دیں
منیجر نگار لکھنؤ

فلسفہ مذہب

اس کتاب کی اہمیت نام سے ظاہر ہے۔ اسے
ملک کے نامور محقق جناب مقبول احمد صاحب نے
تالیف کیا ہے۔

اصل قیمت ۷۰/- رعایتی ۱۲/- علاوہ محصول
منیجر نگار بک اینڈریسی لکھنؤ

مکتوبات نیاز

مکرمی - یہ آپ سے کس نے کہدیا کہ ”گفت و شنید“ غلط ہے۔ اگر شنودن اور شنیدن دونوں صحیح ہیں تو شنید و شنود کو بھی درست ہونا چاہئے، بیدل کہتا ہے:-
 شنیدم کہ شیخ زماں بایزید شے داشت با عشق گفت و شنید
 اب غالباً آپ کو اطمینان ہو گیا ہوگا۔
 آپ نے جس کامیابی پر مبارکباد دی ہے، اس کا شکریہ تو خیر مجھے ادا ہی کرنا ہے، لیکن شاید آپ کو معلوم نہیں کہ

تعمیر باندازہ ویرانی مانیت

یہ میں انسانی تمناؤں کی نامعقول وسعت کے لحاظ سے نہیں کہہ رہا بلکہ بالکل ریاضی کے اصول کے ماتحت دو اور دو چار کی حیثیت سے عرض کر رہا ہوں۔ قسمت کا قایل نہیں کہ ہر تکلیف کو مصلحت خداوندی سمجھ کر خاموش بیٹھ رہوں اور دماغی رجحان یہ کہ رات کو دن اور دن کو رات کہنا کسی طرح گوارا نہیں۔
 لیکن، لاحول ولا قوۃ، میں یہ کیا قصہ لیکر بیٹھ گیا، آپ نے ازراہ محبت میری مسرت کو مسرت مان کر اس میں حصہ لیا اور میں فلسفہ لذت و الم لے بیٹھا۔ باور کیجئے، میں آپ کے جذبہ خلوص کی قدر کرتا ہوں اور آپ کی محبتوں کا ازبس سپاسگزار ہوں۔

قبلہ میر صاحب - تسلیم - یقیناً یہاں کی شیعہ سنی نزاع حد درجہ تکلیف دہ ہے، لیکن میں اسے بھی ڈاکر سی کا گر شتمہ سمجھتا ہوں۔
 والٹر کہتا ہے:-

”یوں اگر تم کوئی بات میرے خلاف کہو تو شاید میں خاموش رہوں گا، لیکن اگر تم نے یہ کہدیا کہ تمہیں ایسا کہنے کا حق حاصل ہے تو میں اپنی جان دیدوں گا“

وقت سوال نہ ہو پھر دینی کا ہے، نہ خلافت و امامت کا بلکہ صرف اس بات کا کہ ایک فرقہ ایک بات کو اپنا حق کہہ کر تسلیم کرانا چاہتا ہے اور دوسرا اسے نہیں مانتا۔

میرے نزدیک یہ سب زندگی کی علامتیں ہیں۔ اگر تمام مسلمان من حیث القوم کچھ نہیں کر سکتے تو من حیث العقیدہ ہی کسی ایک کو تو ابھرنے دیجئے۔ نہ اب مدح صحابہ کوئی وزن رکھتی ہے نہ تبرا، معنوی حیثیت سے دونوں لغو ہیں، لیکن اگر اس بہانہ سے ان میں کوئی احساس زندگی پیدا ہوتا ہے، تو کیا حرج ہے۔ دونوں کو لڑنے دیجئے، اگر کوئی ایک بھی سنبھل گیا تو محنت و حصول ہو گئی، در نہ تباہ ہونا تو اس قوم کی قسمت میں لکھا ہی ہے، آج نہ سہی گل، سیاہی گمراہی سے نہ سہی، مذہبی گمراہی سے، ایک ہی بات ہے۔

صدیقی - خط ملا - میرزا صاحب نے بڑھاپے میں شادی کر لی تو کیا بُرا کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انسان دوسرے حیوانات سے صرف اس لئے ممتاز ہے کہ وہ بغیر پیاس کے پانی پی لیتا ہے اور ہر موسم میں محبت کر سکتا ہے پھر کیا مرزا جی کو تم نے انسان نہیں سمجھا۔

میرا ارادہ فی الحال کہیں باہر جانے کا نہیں ہے اور ہو بھی تو پورا کب ہوتا ہے۔ عزم و ارادہ میں وہ نچٹکی اب کہاں!۔ دل کمزور، دماغ ضعیف، حوصلے پست، ولولے سرور، تفریح کی جگہ ضرورت نے لیلی اور لطف کی جگہ افادیت نے، بات بات میں چون چیرا ہے اور ہر قدم پر عاقبت اندیشاں پس و پیش! انگریزی کے دو فقرے سناتا ہوں ترجمہ ان کا نہیں ہو سکتا اس لئے اصل زبان میں سنو:-

What is matter — never mind.

What is mind — it matters not.

یہ صرف الفاظ کا کھیل نہیں ہے، بلکہ فلسفہ ہے اس دور حیات کا جو اٹھارہ سال کی عمر سے شروع ہوتا ہے اور ۳۰ سال کی عمر میں ختم۔ پھر تمہیں بتاؤ کہ مادہ و نفس دونوں کو بھلا دینے والا زمانہ اب کہاں مل سکتا ہے۔ اب تو یہی دو چیزیں سامنے ہیں اور انھیں کی باہمی جنگ نے بیکار کر دیا ہے۔ تمہیں بتاؤ کہ ان میں صلح و آشتی کی کوئی صورت ممکن ہے یا نہیں؟

عزیزی - کل شفیع کا خط آیا ہے، تمہاری طرف سے وہ بہت پر دل ہیں، تفصیل تو کچھ لکھی نہیں، لیکن بعض فقروں سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید تم نے کوئی وعدہ اُن سے کیا تھا اور پورا نہ کیا۔ کیا یہ صحیح ہے؟ ہر چند میں جانتا ہوں کہ تم نے ارادہ کیا کوئی بات ایسی نہ کی ہوگی جس سے انھیں تکلیف نہ پہنچے، لیکن سوال

لیکن یہ یاد رہے کہ باوصف ان تمام نقالیوں کے آپ کا ”اداشناس“ دنیا میں اگر کوئی ہے تو صرف میں! کیوں ہے نا یہی بات؟

اچھا تو فیصلہ یوں ہونا چاہئے کہ ”سخن طرازی و دانش“ کا دعویٰ میں ترک کرتا ہوں اور ”نالہ حزین“ قبول کرنے کا وعدہ آپ کیجئے۔ یعنی نہ میں یہ کہوں کہ صرف میں ہی آپ کا ”گناہگار“ ہوں اور نہ آپ سوائے میرے کسی اور کو ”مستحق کرامت“ ٹھیرائیں۔

وہ شخص جو انتظارِ ساغر میں زندگی بسر کر رہا ہو، اس کے سامنے آپ خم کے خم لٹکھا دینے کی داستان بیان کریں! کس قدر ظلم ہے!

بکیں دلم، غریب دلم، بنوا دلم!

یہ تو خیر، جواب تھا صرف آپ کی شوخیوں کا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں خود حد درجہ نادم ہوں اور اگر آپ کا خط نہ آتا تو آپ کو مخاطب کرنے کی جرأت شاید اب بھی نہ کر سکتا۔

آپ کے شکوہ و شکایت نے جو اعتماد و محبت میرے دل میں پیدا کر دیا ہے، اس کی بنا پر چند روز زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ بشرط آنکہ آپ اس کی اجازت دیں۔ بولے کیا ارشاد ہوتا ہے۔

دامان چاک چاک و گریباں دریدہ را

کرمی - کئی سال ہوئے علی گڑھ کے ایک صاحب کوئی تذکرہ مرتب فرما رہے تھے اور انھوں نے مجھ سے بھی حالات دریافت کئے تھے۔ جو کچھ میں نے انھیں لکھا تھا وہی آپ کو لکھتا ہوں، یعنی:-

حاصلِ عمر سے سخن بیش نیست

خام بدم، پختہ شدم، سو ختم

میں کیا اور میرے حالات کیا؟ آپ اس کو انکسار کہیں گے، لیکن حقیقت کے اظہار کی بھی تو کوئی صورت دنیا میں ہونا چاہئے۔ پھر آپ کیوں ایک شخص کو اس قدر مجبور کریں کہ جھوٹ بولنا اس کے لئے ناگزیر ہو جائے۔

افسوس ہے کہ میں تعمیلِ ارشاد نہ کر سکوں گا۔ اگر آپ کو ایسی ہی شدید ضرورت ہو تو ”حالی پبلشنگ ہاؤس“ دہلی سے وہ مرقع طلب کر لیجئے، جس میں انھوں نے مصنفینِ اُردو کے حالات معہ اُن کی تصاویر کے شائع کئے ہیں۔ میرے پاس نہیں ہے ورنہ پیش کر دیتا۔

والسلام

اب آپ کیا پوچھتے ہیں کہ میں اس بزم سے کیا لیکر آیا۔ آہ ،

وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم تھی

نگاہ کی قسمیں اتنی ہیں کہ شمار شکل سے ہے :- سرشار - سرکش - تلخ - نوشیں - غلط انداز - عالم آشوب - عافیت سوز
تغافل پسند - گرم خو - عربہ پرور وغیرہ وغیرہ اور فارسی شعرا نے عجیب عجیب انداز سے اس کا ذکر کیا ہے۔
ظہوری کہتا ہے :-

دیوانہ زنجیر نگاہ تو نگشت

دیوانہ کہ دارند زنجیر نگاہش

ملاجامی بخود ایک جگہ لکھتا ہے :-

نگاہ محشر الفت کرشمہ ناز فروش

نگاہ کو ”محشر الفت“ کہنا کس قدر پیاری بات ہے۔

اسی کی دوسری تعبیر سنئے :-

مہیا کرد اسباب جنوں را شوخی حسنش

تسم ساز بہوشی ، نگہ مضرب بتیابی

ظہوری کا ایک شعر قیامت کا سنئے :-

مے نخورد دست غالب ہرگز آنکہ گفت ست مے نگاہش را

لیکن غالب کی یہ نگاہ، جو بظاہر نگاہ سے کم ہے، سب سے جدا ہے۔

اس میں بظاہر کی تفصیص نے جو خصوصیت پیدا کر دی ہے اس کو دیکھ کر بار بار عرفی کا یہ شعر یاد آتا ہے

ہجوم شوق تماشا و تیغ شرم بہیں

کہ دامنش ز نگاہ چکیدہ لبریز ست

”نگاہ چکیدہ“ صرف عرفی کہہ سکتا تھا یا بیدل۔ بہر حال وہ کچھ بھی ہو، اس کا صحیح مفہوم وہیں جا کر معلوم ہوا۔

میں جانتا ہوں آپ نے یہ سوال کیوں کیا ہے ؟ اچھا تو اب آپ اپنی رائے سے مطلع فرمائیے۔

مختار دہن دلی کے مشہور ادیب مرزا صاحب کا ایک تازہ ادبی شاہکار جس میں آپ نے دلی کی سادہ بکھری ہوئی اور دلکش زبان میں ایک تعلیم یافتہ اور مہذب گھرانہ کا قصہ بیان کیا ہے اور ہندوستانی عورتوں کی گھڑتی زندگی کے

بہت سے مسائل پر دلچسپ پیرایہ میں بحث کی ہے۔

کاغذ لکھائی - چھپائی عمدہ ٹائپل خوبصورت سرنگا - دس آنہ کے ٹکٹ بھیج کر ہم سے طلب کیجئے۔

منجبر حلقہ اشاعت - زنبور خانہ - لکھنؤ

باب الاستفسار

حسن و محبت اور امر دہشتی

(جناب یاور حسین صاحب بخاری - رانی کھیت)

ایک اجنبی کا خط موصول کر کے آپ کو تعجب تو نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ آپ ایسی ہستیوں کے نام ایسے خطوط غیر متوقع نہیں کہے جاسکتے۔ مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے اسی لئے تکلیف دے رہا ہوں اور اس امید کے ساتھ کہ آپ میری اس درخواست کو ٹھکرائیں گے نہیں بلکہ یقیناً مجھے مطمئن فرمادیں گے۔ میں تقریباً آپ کی تمام تحریریں دلچسپی کے ساتھ پڑھتا رہا ہوں اور پڑھتا رہتا ہوں۔ رسالہ نگار میں باب الاستفسار کے عنوان کے ماتحت آپ کی سلجھی ہوئی باتوں کو میں نے بہت ہی پسند کی کی نگاہ سے دیکھتا ہے میں آپ سے توقع کرتا ہوں کہ اسی عنوان کے ماتحت آپ سے اس سوال پر بھی جو میں پیش کرنے والا ہوں ایک حتمی و روشنی ڈالیں گے۔

میرے ایک دوست جو حال ہی میں الہ آباد یونیورسٹی سے گریجویٹ ہو کر تشریف لائے ہیں اور انگریزی لٹریچر کا بہت کافی مطالعہ کر چکے ہیں آج تقریباً ایک ماہ سے مجھ سے "فلسفہ محبت" پر بحث فرما رہے ہیں، انہوں نے خود مطمئن ہیں اور نہ میں ہم دونوں کی نگاہیں اس وقت آپ ہی پر پڑ رہی ہیں کیونکہ میں اس امر کا خوب اندازہ کر چکا ہوں کہ آپ کو بھی انگریزی لٹریچر سے بہت زیادہ مس رہا ہے۔ اس بحث نے میرے اور بھی بہت سے احباب کو اس میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا ہے اور ان سب کی طرف سے میں آپ کو آج یہ تکلیف دے رہا ہوں۔ مناسب ہو گا کہ میں ان کے تمام دلائل کو پیش کر دوں مخالفت کے پہلو کا بیان کیا ضرور ہے۔

سنئے فرماتے ہیں۔ انگریزی ادب کا مطالعہ کرنے سے خصوصاً شیکسپیر، کیٹس، شیلی وغیرہ کا کلام بنظر غائر دیکھنے سے اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ ان کا "مقدسود محبت" یا میں یہ کہوں کہ "محبوب" جس کو فنا طلب کیا گیا ہے ہمیشہ مرد رہا ہے اور جہاں "عورت" ہے وہی تودہ نظم جو اس سے متعلق لکھی گئی ہے مقابلہ پست ہے مثال کے

طور پر شیکسپیر کی ہی دو نظمیں کے لیے (To his love) کے عنوان سے جو اس نے لکھا ہے اس میں بہت کامیاب ہوا ہے لیکن اسی کی دوسری نظم جس کا عنوان (Carpe Diem) نسبتاً بہت پست نظر آتی ہے۔ کینٹس کے متعلق اسی کے ایک نقاد کی رائے ہے کہ اس کی شاعری کا موضوع جب کبھی کوئی عورت بن گئی ہے تو گویا اس کے کمال پر ایک سایہ پڑ گیا ہے۔ سر بی سڈنی کی ایک مشہور نظم (A Ditty) ملاحظہ فرمائیے جو اس طرح شروع ہوتی ہے

My true love hath my heart — & I
have his.

اس میں صاف طریق پر شاعر کا محبوب ایک مرد ہے۔

غرض اس قسم کی تذکیر سے جو میں نے سنا ہے فارسی شاعری میں بھی بہت کافی موجود ہے اور اردو میں بھی نظر آتی ہے میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ”معراجِ محبت“ کے لئے محبوب کا مرد ہی ہونا ضروری ہے اور حقیقی محبت صرف ایک مرد اور دوسرے مرد کے ہی درمیان قائم ہو سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں اپنے فلسفہ کے ماتحت میں جن دلائل سے کام لیتا ہوں وہ یہ ہیں کہ عورت سے جو محبت قائم ہوتی ہے وہ حقیقتاً محبت نہیں بلکہ نفس پرستی یا شہوانیت ہے۔ مرد، عورت سے صرف اپنی شہوانیت کو تسکین پہنچانے کے لئے محبت کرتا ہے جو جھوٹی اور بے بنیاد ہوتی ہے، جس میں شہوت کا عنصر ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ برخلاف اس کے مرد اس فدا کوشش کا حامل نہیں ہوتا جو شہوانی جذبات کو مشتعل کر سکے اس لئے اُس سے جو محبت ہوگی وہ یقیناً بے ثبات اور دیر پا ہوگی۔ آسکر وائلڈ کا کلام دیکھنے سے اور خصوصاً اس کا ناول (The Picture of Dorian Gray) پڑھنے سے اس امر کا کافی ثبوت ملتا ہے۔

”حسن!“ ہاں محبت کے لئے میں حسن کو ضروری سمجھتا ہوں، جب تک کوئی چیز حسین نہ ہو اور جذبات کو متحرک نہ کر سکے اس سے محبت نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس سلسلہ میں صرف حسن صورت پر ہی نظر رکھنا غلط ہے۔ چنانچہ عورت جذبات و جذبات کے لحاظ سے بہت زیادہ پست ہوتی ہے۔ دوسرے حسن ظاہری کے اعتبار سے بھی ”وہ حقیقی حسن کی مالک نہیں ہوتی“ اس کا حسن صرف نفسانیت کو براہِ نیچہ کر سکتا ہے، برخلاف اس کے مردانہ حسن صرف ”جذبات لطیف“ کو ابھارتا ہے۔

سب سے بڑا ثبوت اس امر کا یونانی سنمیات کے پڑھنے سے ملتا ہے۔ یونانی اپنے وقت کے بہترین صنّاع اور آرٹسٹ تھے جس کی تاریخ شاہد ہے۔ ان کا بہترین آرٹ اور حسن مردانہ کے مجسمہ اب تک پائے جاتے ہیں انھوں نے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ ”حقیقی حسن“ ایک مردانہ جسم میں ہی پوشیدہ ہے چنانچہ انھوں نے اس حسن کی قدر کرنا اور اس سے محبت کرنا شروع کر دیا — یہ دوسری بات ہے کہ حضرت لوط کے زمانہ میں یہی چیز بہت ہی ذلیل صورت میں نمودار ہوئی۔

کیا یہ واقعاً صحیح ہے کہ ایک آرٹسٹ کی نگاہ میں مرد کا حسن عورت کے حسن پر فوقیت

رکتا ہے؟

(نگار) افسوس ہے کہ آپ نے حسن و محبت کا یہ افسانہ اس وقت چھپا جب میں

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا

لیکن چونکہ ان کا سی لذت حاصل کرنے کی اہلیت ہنوز باقی ہے اس لئے اگر چند لمحے اس "تاشا" میں بھی صرف ہو جائیں تو کیا حرج ہے۔

حسن و محبت کے باب میں جب گفتگو کا موضوع یہ قرار پاتا ہے کہ حسن کیا ہے اور محبت کیا، یا یہ کہ جذباتِ عشق کے ابھارنے کی اہلیت کس میں ہے اور کس میں نہیں، تو بات جوانی کے صدر دسے گزر کر عقل و ہوس کی اس دنیا کی ہو جاتی ہے جو جوانی کھونے کے بعد ہی میسر آتی ہے۔ اس لئے آپ لوگوں کے متعلق کم از کم یہ تو معلوم ہی ہو گیا کہ محبت کا جذبہ تو فی الحال آپ میں سے کسی میں نہیں پایا جاتا، علی الخصوص آپ کے دوست جو یونیورسٹی کی زندگی بسر کر کے واپس آئے ہیں کہ ان میں تو خیر ہونا ہی نہیں چاہئے، اور اگر کوئی کیفیت ان میں باقی ہے تو یقیناً اس کا تعلق "محبت افلاطونی" (Platonic love) ہی سے ہوگا۔

"حسن و محبت" کی بحث میں لوگ غلطی سے پہلے حسن کا مفہوم متعین کرنا چاہتے ہیں، درانحالیکہ سب سے پہلے ہمیں محبت کا تجزیہ کرنا چاہئے کہ وہ کیا چیز ہے۔ آپ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ محبت کے لئے حسن کا ہونا ضروری ہے اور حسن میں آپ ظاہری و معنوی جمال دونوں کو شامل کرتے ہیں، یہ درست ہے، لیکن اگر میں آپ کو چھپور کہ حسن سے آپ کی کیا مراد ہے، تو شاید آپ خدوخال کا ذکر شروع کر دیں گے درانحالیکہ یہ کوئی معیار نہیں۔ دیکھو ایک چیز ہے جو سمجھ بڑی معلوم ہوتی ہے لیکن آپ اسے پسند کرتے ہیں، آپ کے لئے ناپسندیدہ ہے اور میرے لئے مرغوب۔ آپ بڑی بڑی آنکھوں پر جان دیتے ہیں درانحالیکہ ایک حبشی اپنی معشوقہ کی آنکھ کی تعریف بول کر تا ہے کہ:- "عینہا کا لسمم و لسمم اکبر منہ" (اس کی آنکھ تل کی طرح ہے اور تل اس سے کچھ بڑا ہے) یوروپ کا باشندہ گورے رنگ کی عورت پر جان دیتا ہے لیکن حبشہ والے مبروص سمجھ کر اس سے بھاگتے ہیں۔ اسے جانے دیجئے، آپ ایک ہی ملک، ایک ہی جماعت، ایک ہی قوم کے مختلف افراد کے ذوق کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ حسن کے باب میں کوئی متفق علیہ نظریہ ایسا قائم نہیں کیا جاسکتا کہ ہم اس کو معیار قرار دیکر ہر شخص کے حسین یا غیر حسین ہونے پر حکم لگا سکیں۔ اس لئے ہم کو حسن کا مفہوم اس شے سے ہٹ کر ڈھونڈنا پڑے گا جسے حسین کہا جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس باب میں محبت سے زیادہ رہبری کرنے والی کوئی چیز نہیں۔

جیسا آپ نے فرمایا یہ بالکل سچ ہے کہ جب تک کوئی شے حسین نہ معلوم ہوگی ہم کو اس سے محبت نہ ہوگی اور

یہیں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہر وہ چیز میرے لئے حسین ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ حسن کا مذاق خود ہمارا جذبہ محبت ہے اور محبت سے قطع نظر کرنے کے بعد اس کا وجود کہیں نہیں پایا جاسکتا۔

لہذا سب سے پہلے ہمیں محبت کا مفہوم جان لینا چاہئے کہ اس کے بعد حسن کا مفہوم خود متعین ہو جائے گا۔ محبت کا مفہوم اگر زیادہ وسیع لیا جائے تو ہمارے پاس ایک لفظ اس سے بہتر موجود ہے۔ انجذاب۔ یعنی کسی کی طرف کھینچنا اور اس صورت میں حسن کو ہم جذبہ کہیں گے، یعنی کسی کو اپنی طرف کھینچنا۔ گویا حسن و محبت کو ٹھیکہ ہندوستانی زبان میں کھینچتا اور کھینچنا کہیں گے اور اس ”کھینچا تانی“ کا نام دنیائے حسن و عشق ہے۔

اس جگہ یہ بحث بالکل فضول ہے کہ ایک چیز ہمارے لئے باعث کشش کیوں ہوتی ہے۔ ماہرین سائنس کا بیان ہے کہ ہر شخص کے جسم سے برقی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں اور جب دو شخصوں کی شعاعیں منفی و مثبت ہونے کے لحاظ سے ٹھیک بڑھ جاتی ہیں تو باہد گر محبت ہو جاتی ہے، لیکن میرے نزدیک یہ صرف ظن و قیاس ہے اور اگر اس میں کوئی اصلیت ہو بھی تو اس کا تعلق صرف شہوانی محبت سے ہو سکتا ہے، محبت کے مفہوم کلی پر اس کا انطباق نہیں ہو سکتا۔ بہر حال وہ برقی شعاعوں کا اثر ہو یا انیشیٹین کے نظریۂ اضافت کا یا کسی اور کیسا وہی تعبیر کا محبت و حسن کی تعبیر ”جذبہ و انجذاب“ سے بہتر کسی اور لفظ سے نہیں ہو سکتی اور اسی کو سامنے رکھ کر اس پر غور کرنا چاہئے۔

آپ نے غور کیا ہوگا کہ جذبہ کشش صرف انسانوں ہی کی دنیا کی چیز نہیں ہے، بلکہ نباتات و حیوانات کی دنیا میں بھی اسی کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ آپ کے یونیورسٹی والے دوست نے اگر اپنے جامعہ میں Botany اور Zoology کا مطالعہ کیا ہوگا تو وہ اس کی تصدیق کر سکیں گے، لیکن خیر اس قدر زیادہ وسیع نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں، خود انسانوں میں دیکھئے کہ اس جذبہ و انجذاب کی کیفیت کتنی مختلف ہیں۔ پہلے اس کی دو بڑی تقسیمیں کرنا پڑیں گی، ایک انسان کی محبت انسان سے اور دوسرے ایک انسان کی محبت غیر انسان سے۔ ہم ایک پھول کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور بے اختیار نہ ہمارا ہاتھ یا ہمارا شامہ اس کی طرف کھنچ جاتا ہے، ہم شام کو شفقی رنگینیاں دیکھتے ہیں اور ہماری نگاہ اس طرف کھنچ کر رہ جاتی ہے، ہم ایک جانور پالتے ہیں اور جب وہ ہمارے پاس آتا ہے تو بے اختیار اس پر ہاتھ پھیرنے لگتے ہیں۔ یہ بھی سب اسی کشش کے کرشمے ہیں لیکن اس کا تعلق ہمارے ذوق یا ہماری اس فطرت سے ہے جو ہمارے اندر نرمی و لطافت کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور جس کا سبب ہم کو کچھ نہیں معلوم۔

انسان کی محبت انسان سے۔ اس کی نوعیت بھی ایک نہیں ہوتی۔ ماں کی محبت بچے سے اور بچے کی محبت ماں باپ سے، بھائی کی بھائی سے، دوست کی دوست سے، یہ سب ایک دوسرے سے جداگانہ کیفیت رکھتی ہیں

اور ان میں سے کوئی ایسی نہیں جہاں جذبہ شہوانی کام کر رہا ہو۔ اس لئے یہ کہنا کہ محبت جہاں کہیں ہے اس جذبہ سے خالی نہیں، نادرست ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ میں اس کا بھی قائل نہیں کہ مرد کی محبت امرد کے ساتھ اس جذبہ سے خالی ہوتی ہے۔

اگر شکسپیر، کٹیس اور شیلی کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ امرد پرست تھے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ وہ تھے واقعی ایسے ہی اور قد رٹان کی ایسی نظموں میں زیادہ جوش ہونا چاہئے، جن کے مخاطب نوجوان لڑکے ہیں شعراء انگلستان میں علاوہ ان کے مارلو، سوفٹ، جان فلیچر، بارٹن اور ٹینیسن کا بھی یہی ذوق تھا۔ ٹینیسن کے محبوب کا نام بھی شاید آپ کو معلوم ہو کہ آرتھر ہیلم تھا۔

آسکر وائلڈ کا ذکر آپ نے پاک محبت کرنے والوں کے سلسلہ میں خوب کیا۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس سے زیادہ امرد پرست ادیب شاید ہی اس زمانہ میں کوئی پیدا ہوا ہو۔ آپ نے اس کی کتاب پیکچر آف ڈورین گرے کا ذکر کر کے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ اس کی محبت پاک و بے لوث تھی۔ وائلڈ پر اس سے زیادہ ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس نے تو یہ نام ہی اس لئے رکھا تھا کہ اس کی بے لوثی کی طرف غلطی سے بھی کسی کا خیال نہ جائے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ ڈورین ایک یونانی نسل کی قوم تھی جس میں یہ ذوق حد درجہ ترقی کر گیا تھا بلکہ محققین کی رائے تو یہ ہے کہ یونان میں سب سے پہلے اس قوم نے امرد پرستی کی بنیاد ڈالی ورنہ ہومر کے زمانہ میں یہ ذوق وہاں نہ پایا جاتا تھا۔

شعراء کے علاوہ یورپ کے بعض نقاشوں میں بھی یہ ذوق پایا جاتا تھا۔ فرانس کا مشہور نقاش لیونارڈو اسی ذوق کی بدولت کئی بار قید کیا گیا اور میکائیل انجلو کے خطوط و منظومات تو یکسر اس قسم کے جذبات سے لبریز ہیں ایک اور مشہور نقاش سلینی تھا وہ بھی اس جرم میں مقید کیا گیا اور جبرم تو اسی کی بدولت قتل کیا گیا۔

اس میں شک نہیں کہ یونانی اپنے وقت کے بڑے صنّاع تھے، لیکن وہ جتنے بڑے صنّاع تھے اتنے ہی بڑے امرد پرست بھی تھے۔

شہر سدوم (Sodom) اس باب میں جتنا بدنام تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ساڈومی (Sodomy) کے معنی ہی لواطت کے ہو گئے۔ میں اس قسم کے تاریخی واقعات کہانیاں بیان کروں اور کس کس ملک کا ذکر کروں، تقریباً ہر جگہ یہ ذوق پایا جاتا تھا اور اب بھی بہت سے اللہ کے بندے ایسے ہیں جو اس پر جان دیتے ہیں، لیکن اس ذوق کو معصومیت، بے لوثی، یا پاکیزگی کے ثبوت میں پیش کرنا اس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ کم از کم میری سمجھ میں تو آتی نہیں، ممکن ہے آپ کے یونیورسٹی والے دوست نے کوئی صورت طہارت کی اس میں پیدا کر لی ہو۔

نوجوان لڑکوں کی طرف رغبت سوائے جذبہ شہوانی کے اور کوئی معنی رکھتی ہی نہیں اور اگر اخلاقیات کے

نقطہ نظر سے یہ کوئی ایسی بات ہے جس کو آزادی سے نہیں کیا جاسکتا، تو محض اس دلیل کی بناء پر کہ شیکسپیر یا شیلی کا بھی یہی ذوق تھا اس کو جذبہ مقدس ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

آپ نے جس فلسفیانہ بلند محبت کا ذکر کیا ہے وہ دو پختہ عمر کے ہمن مردوں میں تو بیشک پائی جاسکتی ہے لیکن نوجوان لڑکوں کے ساتھ قطعاً اس کا امکان نہیں اور جب کوئی شاعر کسی مرد کے ساتھ اپنے جذبات محبت کا ذکر کرے گا تو وہ یقیناً ڈورین قسم کا مرد یا لڑکا ہوگا۔

آپ کا یہ کہنا کہ عورت حقیقی حسن کی مالک نہیں ہوتی، کوئی معنی نہیں رکھتا، اول تو حسن ہی علیحدہ کوئی چیز نہیں ہے چہ جائیکہ حقیقی۔ مرد جب تک عورت کی طرف کھنچتا رہے گا وہ حسین رہے گی اور عورت جب تک مرد کی طرف کھنچتی رہے گی وہ حسین رہے گا۔

ربا یونانیوں کے آرٹ کا حسن مردانہ سے متعلق ہونا اس کا سبب وہی ذوق تھا جس کا ذکر اوپر کیا گیا اور اگر اس کی پوری داستان آپ کو دیکھنا ہے تو میری کتاب شہوانیات کا مطالعہ کیجئے، جس میں نہایت تفصیل کے ساتھ یہ سب کچھ بیان کیا گیا ہے۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ وہ لوگ جو اس ذوق کے دلدادہ ہیں اس کی ایسی ہی تاویں کیا کرتے ہیں، لیکن میں اسکو حد درجہ کمزوری و فریب خیال کرتا ہوں۔ اگر آپ اسے واقعی مذموم نہیں سمجھتے تو پھر علی الاعلان اس کو اختیار کیجئے جس طرح آج کل جرمنی میں اس کی تبلیغ جاری ہے۔ اس سے کیا فائدہ کہ اس کی رکیک تاویلیں کی جائیں اور فلسفہ و تصوف کی آڑ پر کریہ شکار کھیلا جائے۔ دنیا کی کوئی بُری چیز اس لئے اچھی نہیں ہو سکتی کہ اس کا ایک فلسفہ بیان کیا جاتا ہے جدید تعلیم یافتہ حضرات نے فلسفہ کو ایک کھیل بنا رکھا ہے اور جب گفتگو کرتے ہیں تو دوسروں کو مرعوب کرنے کے لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی فلسفہ ضرور پیش کر دیا کرتے ہیں، دراصل ایک وہ محض فریب نفس ہوتا ہے۔

یقیناً محبت کا فلسفہ ہے لیکن بالکل نفسیاتی اور اسدرجہ آسان کہ اس کو سمجھنے کے لئے زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں ہر چیز کا ایک سبب ہو اکر تا ہے اور ایک غایت، اسی طرح محبت کی بھی وجہ و غرض ہونا ضروری ہے۔ اب آپ محبت کی جتنی صورتیں ہیں ان پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ بعض فطری ہیں اور بعض اکتسابی۔ مثلاً ماں باپ بھائی بہن اور اولاد کی محبت کہ یہ تو بالکل فطری چیز ہے اور اس سے بحث کی ضرورت نہیں۔ رہی اکتسابی صورت سو اس کے یہ سبب ہو سکتے ہیں، مادی منفعت، عظمت و احترام، ہم آہنگی خیال اور جذبہ شہوانی۔

امراء سے ہماری محبت مادی نفع کی بناء پر ہوتی ہے، پیروں فقیروں اُستادوں اور لیڈروں سے محبت کا سبب جذبہ عظمت و احترام ہوتا ہے اور دوستوں سے ہم آہنگی خیال۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ جذبہ شہوانی ہے خواہ اس کا ہدف جنس لطیف ہو یا جنس کرخ۔ آپ اس کا مطالعہ دوسرے زاویہ سے بھی کیجئے، وہ یہ کہ

شیلی وغیرہ نے جو نظمیں ایسی لکھی ہیں ان میں جن جذبات کا اظہار کیا گیا ہے وہ عورت کے ساتھ بھی پیدا ہو سکتے ہیں یا نہیں، یعنی اگر آپ مردانہ ضمائر کو بدل کر نسوانی ضمائر رکھ دیں تو مفہوم وہی رہتا ہے یا نہیں۔ اگر رہتا ہے تو یقیناً آپ اسے جذباتِ شہوانی کا نتیجہ کہیں گے اور اگر بدل جاتا ہے تو وہ نظم عاشقانہ نہیں ہے بلکہ جذباتِ عظمت و احترام یا ہم آہنگی ضمیر کی بنا پر لکھی گئی ہے اور اس کا انداز بیان بھی یقیناً بالکل مختلف ہوگا۔

آپ اگر غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس طرح کے مخاطب میں بعض اوقات شاعر کالب و لہجہ لسانی ہو جاتا ہے اور نتیجہ ہے ذہنی (Bin Sexuality) ہونے کا جو قبول ہو یا کہ بلیس اکثر ذہنی افراد میں پایا جاتا ہے اور جس نے جولیسن قصیر کے متعلق عام طور پر یہ بات مشہور کر دی تھی کہ ”وہ سب عورتوں کا شوہر اور سب مردوں کی جوروں ہے۔“

بہر حال جو صاحب بھی اس ذوق کے حامی ہوں وہ اس میں فلسفہ تقدس و پاکیزگی تو پیدا کریں نہیں، البتہ وہ اس کے جواز میں تاریخی حوالے ضرور پیش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ارسطو اور سقراط کے اقوال سے بھی ان کو مدد مل سکتی ہے اور وہ دنیا کی بعض اُن بڑی بڑی ہستیوں کو پیش کر سکتے ہیں جنہوں نے فن کی حیثیت سے اسے اختیار کیا اور اخلاقی نقطہ نظر سے اسے معیوب نہیں جانا۔

جرمنی، ہمیشہ سے فلسفہ کا مرکز رہا ہے اور اب بھی ہے، لیکن وہاں سے زیادہ اس کا رواج کسی اور جگہ کم ہوا ہے۔ وہاں کا ایک مشہور شاعر ہنری فان کلیسٹ تھا اس نے اپنے محبوب ارنسٹ فان فیول کو ایک خط لکھا کہ:-

”تم نے میرے لئے یونانیوں کا دورِ قدیم پیدا کر دیا ہے، میری روح تمہارا احاطہ کئے ہوئے ہے، جب تم جھیل میں نہاتے تھے تو میں تمہارے خوبصورت جسم کو تکا کرتا تھا۔ آؤ، میرے ساتھ انسپاخ چلو اور عشق و محبت کے لطف اٹھاؤ۔ میں کبھی شادی نہ کروں گا۔“

وہاں اگر ایک طرف الگزمڈر فان ہمبولٹ ایسا صاحب فضل و کمال اس ذوق میں مبتلا نظر آتا ہے تو دوسری طرف کرپ ایسا صنعتی بھی (جس کے کارخانہ آہن نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی تھی) اس کا دلدادہ ہے۔ جرمن اہل قلم میں پلیٹن، مارٹنز، ایفلینڈ کو کون نہیں جانتا، اور اس باب میں ان کی سند بھی پیش کی جاسکتی۔ علاوہ اس کے وہاں اب بھی یہ تحریک کھلم کھلا پائی جاتی ہے اور اس کے متعلق جتنی کتابیں جرمنی سے شائع ہوئی ہیں اتنی دنیا کے کسی ملک سے شائع نہیں ہوئیں۔

بہر حال مدعا یہ ہے کہ ہر فعل اسی فعل کی نوعیت سے دیکھنا چاہئے۔ اگر شیکسپیر یا شیلی وغیرہ امرِ پرست تھے تو ان کو ایسا ہی ظاہر بھی کیجئے، آپ کیوں اُن کے اس ذوق کی وہ تاویل کریں جو شاید انھیں بھی پسند نہ آتی اگر آج وہ زندہ ہوتے۔

مطبوعات موصولہ

من کی دنیا | مختصر مجموعہ ہے جناب رشید قریشی کے بائیس افسانوں کا جن میں سے بعض مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اس مجموعہ کے نام ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کا تعلق صرف دل کی دنیا سے ہے اور دل کی دنیا چونکہ بہ لحاظ تخیل بہت آزاد واقع ہوئی ہے، اس لئے اس کے بعض فسانے بڑی حد تک "کھل کھیلنے" کی مثال میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

نوجوان فسانہ نگار نے کوشش کی ہے کہ جو کچھ ان پر گزری ہے یا اپنے اوپر گزرا دینا چاہتے ہیں وہی قلمبند کریں اس لئے فسانوں میں نہ تازگی و جدت کی کمی ہے اور نہ بیباکی و جرأت رندانہ انداز بیان میں ادبیت بھی ہے اور سلاست و روانی بھی۔ علاوہ اس کے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس وقت حیدرآباد میں جس طرح کی اردو بولی جاتی ہے اس کے نمونے بھی اس میں اکثر جگہ ملتے ہیں۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد۔

تمثیلی مشاعرہ | نتیجہ ہے ہمارے فاضل دوست جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی جدت فکر کا۔ یہ ایک ڈرامہ ہے جس میں سودا، درد، تیر، جرات، مصحفی، انشاء، آتش، نسیم، ناسخ، ذوق، موہن اور غالب کو ایک جگہ جمع کر کے بزم مشاعرہ قائم کی گئی ہے۔

ہر چند یہ تمام شعراء ہم عصر نہیں ہیں، لیکن چونکہ جناب کیفی نے ان سب کو عالم بالا سے طلب کر کے یہ محفل منعقد کیا ہے اس لئے سوال تقدم و تاخر کا باقی نہیں رہا اور وہ اجتماع جسے قدرت بھی نہ کر سکی تھی، کیفی صاحب نے کر دکھایا۔ آداب مشاعرہ کی جتنی مادی و غیر مادی خصوصیات ہو سکتی ہیں، کیفی صاحب نے ان سب کو پیش نظر رکھا ہے، یہاں تک کہ دوران غزل خوانی میں بہ سلسلہ مرحبا و آفریں جو انتقادی یا تحسینی فقرے سامعین و شعراء کے زبان سے نکل جاتے ہیں وہ بھی درج کر دئے گئے ہیں۔

یہ ڈرامہ جناب پروفیسر محمد عبداللہ صاحب کامل کے اہتمام سے لایل پور کالج میں پیش کیا گیا تھا اور کہا جاتا ہے کہ بہت کامیاب رہا۔ بہر حال فن تمثیل کے لحاظ سے اس کی نوعیت جو کچھ بھی رہی ہو، لیکن ادبی و انتقادی حیثیت سے یہ کتاب ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

اس نوع کی پہلی کوشش مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے کی تھی، لیکن وہ ایک مخصوص زمانہ کے چند شعراء تک محدود تھی، کیفی صاحب نے اس خیال کو زیادہ وسعت کے ساتھ پیش کیا، یہ ڈرامہ آرٹ پیر پر نہایت صاف طباعت کے ساتھ مجلد شائع ہوا ہے اور انجمن ارباب ذوق لایل پور سے ایک روپیہ میں مل سکتا ہے۔

راز و نیاز | جناب اشعر دہلوی کی چند غزلوں کا مجموعہ ہے۔ خود شاعر نے دیباچہ میں اپنے کلام کے متعلق جو رائے ظاہر کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے "مناسب الفاظ" لانے کی پوری کوشش کی ہے اور اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ:-

"مذکورہ بالا خصوصیت کے علاوہ اگر کوئی معنوی خوبی میرے کلام میں نظر آئے تو اس کو میرے کمال فن پر محمول نہ کیجئے گا بلکہ کسی شباب سے بھرپور ہستی کی چشم سحر کار کی افسوں طرازی کا نتیجہ خیال کیجئے گا کہ میری یہ تمام رنگین بیابیاں اور نازک خیالیاں اسی کی رہیں منت ہیں۔"

گویا یہ غزلیں جناب اشعر کی حیات عشقیہ کی داستانیں ہیں اور اس لئے یقیناً انھیں برکیت ہونا چاہئے، لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے کلام کا عنصر غالب رنگینی و نازک خیالی ہونا چاہئے، جس کے وہ مدعی ہیں یا بجز وفادگی جو ان میں بالکل نہیں پائی جاتی۔

سرسری مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اشعر صاحب نے جگر کا متبع کیا ہے اور ان کے کلام میں ایک طرح کی مستی ضرور پائی جاتی ہے، کلام صاف ہے اور بعض جگہ مضمون آفرینی و ندرت بیان بھی پائی جاتی ہے، لیکن باوجود "مناسب الفاظ" کی تلاش کے وہ کہیں کہیں ناکام رہے ہیں مثلاً

دل ترے تیر کا منت کش احساں نکلا

منت کش کے بعد لفظ احساں بیکار ہے۔

یا

یہاں سو خرمین حرف و حکایت قلب سوزاں میں

حرف و حکایت کے لئے خرمین موندوں لفظ نہیں ہے بلکہ دفتر ہونا چاہئے۔

بہر حال اشعر صاحب کی غزلیں بری نہیں ہیں اور جگر کا رنگ پسند کرنے والوں کے لئے ان میں کافی سامان دلکشی موجود ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ:- دائرۃ الادب محلہ روڈ گراں دہلی۔

انشاء سلمیٰ | جناب صاحبزادہ ولی احمد خان صاحب ام۔ اے نے زمانہ خط و کتابت سے متعلق یہ مجموعہ مرتب کیا ہے اور دفتر عصمت دہلی سے شائع ہوا ہے، خطوں کی زبان بہت صاف و سہل ہے اور تکلفات سے بری۔ آخر میں بعض مشکل الفاظ کے معنی بھی دیدئے ہیں اور ترتیب مدارج کے لحاظ سے القاب و آداب بھی۔ قیمت ۶/- ہے۔

دیہاتی گیت | یہ کتاب بھی عصمت بک ڈبودہلی نے شائع کی ہے، اس میں جناب اعظم کروڑی نے بہت سے وہ گیت اکٹھا کر دئے ہیں جو گاؤں میں مختلف موسموں اور تقریبوں میں گائے جاتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ ان کا مفہوم بھی دیدیا گیا ہے جس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ اس وقت تک کوئی مجموعہ اس موضوع پر ہماری زبان میں شائع نہ ہوا تھا حالانکہ (Folk Song) کتابیں ادب کے لئے ضروری ہیں۔

مفتاح العربیہ | قاضی زین العابدین صاحب، سجاد میرٹھی نے عربی زبان سکھانے کے لئے یہ سلسلہ تالیف شروع کیا ہے جس کے پہلے دو حصے ریویو کے لئے ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ اس مقصد کے لئے ملک میں متعدد کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں سے بعض مفید ہیں اور بعض غیر مفید۔ مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ سجاد صاحب نے جس انداز سے یہ سلسلہ شروع کیا ہے وہ یقیناً مفید و کارآمد ہے۔ پہلے حصہ میں انھوں نے معرفہ و نکرہ ترکیب اضافی و توصیفی اور افعال و اسماء کی مختلف اشتقاقی و ترکیبی صورتوں سے بحث کر کے مشق کرائی ہے اور دوسرے حصہ میں مختصر حکایات، مراسلات اور صحافت جدیدہ تک پہنچ گئے ہیں۔

ہر حصہ کے اخیر میں ایک فرہنگ بہت سے قدیم و جدید الفاظ کا دیدی گئی ہے جو ایک مستقل افادہ کی چیز ہے جو حضرات عربی زبان جلد سیکھنے کے شائق ہیں ان کے لئے اس سلسلہ کا مطالعہ از بس مفید ہے۔ ہر حصہ کی قیمت ۱۰ ارہے اور ملنے کا پتہ مکتبہ علمیہ، میرٹھ۔

کلیات بحری | بارہویں صدی بحری کے آغاز میں ایک دکنی شاعر بحری پائے جاتے تھے یہ زمانہ اورنگ زیب کی حکومت کا تھا۔ ڈاکٹر محمد حفیظ سید کو شولا پور میں ایک نسخہ ان کے کلیات کا ملگیا اور انھوں نے اس کو جدید اصول پر مرتب کر کے نو لکشور پریس لکھنؤ سے شائع کرایا ہے۔

بحری، دلی سے پہلے گزرے ہیں اور ان کی زبان فارسی، ہندی اور دکنی ملی جلی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ صاحب کا یہ ریسرچ ادب اردو کی تاریخ میں ایک قیمتی اضافہ ہے اور ارباب ذوق کو اس کی قدر کرنا چاہئے۔ کتاب مجلد، دبیز کاغذ پر شائع کی گئی ہے اور ۳۱۲ صفحات پر محیط ہے۔ قیمت تین روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ نو لکشور پریس لکھنؤ۔

ہندوستانی | جناب دین محمد صاحب نے انگریزی زبان میں یہ پمفلٹ شائع کیا ہے اور لسانی و تاریخی حیثیت سے ہندوستانی زبان پر بحث کی ہے۔

اس وقت ملک کی عام زبان کا مسئلہ بہت اہم مسئلہ سمجھا جاتا ہے اور اردو ہندی نزاع نے اس میں چند چند پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں۔ ملک میں ایک نئی زبان ہندوستانی کے نام سے پیدا کی جا رہی ہے، لیکن وہ کیا ہے یا اسے کیا ہونا چاہئے ہنوز معرض بحث میں ہے۔ ہندوؤں کا رجحان یہ ہے کہ اس میں سنسکرت کے الفاظ زیادہ

ہونا چاہئے اور مسلمان کہتے ہیں کہ جب اس سے عربی و فارسی الفاظ خارج کئے جا رہے ہیں تو پھر سنسکرت الفاظ کا شمول اس میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جناب دین محمد صاحب نے اس مسئلہ کے ہر پہلو کو لیکر نہایت فاضلانہ گفتگو کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی زبان ہندو مسلمانوں کی مشترکہ زبان ہے جو آپس کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے اور اس کی آئندہ ترقی بھی اسی باہمی مسالمت و رواداری پر منحصر ہے۔ یہ پفلٹ مطالعہ کے قابل ہے اور ۱۲ میں مصنف سے ہال بازار امرتسر کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

رپورٹ ہندوستانی اکاڈمی | ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد نے اس انگریزی رپورٹ میں قیام اکاڈمی کے آغاز سے اس وقت تک کی کیفیت پیش کی ہے۔ یہ اکاڈمی ۱۹۲۷ء میں حافظ ہدایت حسین مرحوم کی تحریک و کوشش سے قائم ہوئی تھی اور مقصد یہ تھا کہ ہندی اُردو لٹریچر کی ترقی کے لئے کوشش کی جائے اور حکومت اس کی مالی مدد کرے۔

اکاڈمی کی گزشتہ تاریخ اور اس کے کارناموں پر بحث کرنے کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے لیکن سلسلہ ریویو ہم اس قدر ضرور عرض کریں گے کہ اس وقت جبکہ حکومت اس کی تنظیم کے مسئلہ پر غور کر رہی ہے، اسکو زیادہ کارآمد و مفید بنانے کی ضرورت ہے، خصوصیت کے ساتھ ایسی حالت میں کہ زبان کا مسئلہ بابہ النزاع بنا ہوا ہے۔

سیاسیات کی پہلی کتاب | پروفیسر محمد عاقل ام۔ اے نے مبادی سیاسیات پر یہ رسالہ لکھ کر بڑی محلِ خدمت انجام دی ہے۔ اب وقت ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو سمجھنا چاہئے کہ حکومت کس چیز کا نام ہے، اس کی کیا صورتیں دنیا میں پائی جاسکتی ہیں اور ہمارے لئے وہ کس صورت میں مفید ہو سکتی ہے۔

اس رسالہ کی زبان، اس کا انداز بیان نہایت سلیس و شگفتہ ہے اور مغزو معنی کے لحاظ سے کچھ کہنے کی اس لئے ضرورت نہیں کہ عاقل صاحب اسی چیز کی تلاش میں اب پوست ہی پوست رہ گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کو ثانوی مدارس کے نصاب میں داخل کیا جائے تاکہ ہمارے نوجوانوں کو ابتداء ہی میں سیاسیات سے لگاؤ پیدا ہو جائے۔ یہ رسالہ مکتبہ جامعہ دہلی سے ۴۴ میں مل سکتا ہے۔

اجتماعی زندگی کی ابتدا | یہ رسالہ بھی پروفیسر محمد عاقل صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ انسان دنیا میں کیونکر آیا اور رفتہ رفتہ اس نے کس طرح ترقی کی۔ اس میں عہدِ حجری سے لیکر عہدِ ایجادات تک کا ذکر کر کے یہ بتایا ہے کہ اس کی انفرادی زندگی نے کس طرح رفتہ رفتہ اجتماعی حیثیت اختیار کی اور اس کی کن کن صورتوں کا تجربہ اس نے کیا۔ یہ کتاب مکتبہ جامعہ سے ۸ میں مل سکتی ہے۔

ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ | اس رسالہ کو بھی مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے۔ اس کی اہمیت سے ظاہر ہے۔ ڈاکٹر زین العابدین صاحب نے اس مسئلہ کے

تمام پہلوؤں پر نہایت جامعیت سے نگاہ ڈالی ہے۔ قیمت ۴۰

میری کہانی | جناب سید علی صاحب شاہ کرام۔ اسے کالکھا ہوا، نیم مزاحیہ افسانہ ہے جسے حمایت دکن پرس حیدر آباد نے شائع کیا ہے۔ شاہ صاحب کے مزاح میں ایک خاص جان پائی جاتی ہے جس میں بہت کچھ امکانات ترقی پوشیدہ ہیں۔ غالباً شاہ صاحب کی یہ پہلی کوشش ہے۔ لیکن اپنے اندر وہ تمام علامتیں رکھتی ہے جو مشق و تجربہ کے بعد معیاری چیزیں ہو جاتی ہیں۔ زبان ٹکسالی ہے اور خیال میں جدت، لیکن تکلف سے خالی نہیں۔ امید ہے کہ رفتہ رفتہ بے ساختہ پن بھی پیدا ہو جائے گا اور شاہ صاحب ملک کے مشہور مزاحیہ نگاروں میں شمار کئے جائیں گے۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہے اور ملنے کا پتہ حمایت دکن پرس۔

محبت کا فسانہ | ملک کے مشہور ادیب ل۔ احمد اکبر آبادی کالکھا ہوا افسانہ ہے اور تمام اُن خصوصیات کا حامل ہے جو ان کی انشاء کی مقبولیت کا باعث ہیں، اس میں انھوں نے فلسفہ از دواج کو پیش نظر رکھ کر بیوی اور شوہر کی نفسیاتی تحلیل کی ہے اور ایسے لطیف انداز سے کہ کتاب نے بیک وقت فلسفہ و انشاء بدیع دونوں کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ مکالمہ میں اگر انگریزی انداز اختیار نہ کیا جاتا تو بہتر تھا۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:۔ عظیم اطہر، محلہ من ٹولہ۔ آگرہ۔

من کی بتیا | لطیف النساء بیگم بی۔ اسے کے چند مقالات کا مجموعہ ہے جس میں متوسط طبقہ کی خواتین کو مخاطب کر کے ان کی معاشرتی و اخلاقی کمزوریوں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ روپے اور ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔

مرقاۃ القرآن | عربی سکھانے کی پہلی کتاب ہے جس میں ۴۰ اسباق قرآن مجید کی آیات سے اخذ و اقتباس کر کے دیئے گئے ہیں۔ اس کے مولف مولوی محمد عبداللہ صاحب کامل پروفیسر گورنمنٹ کالج لائل پور ہیں۔ یہ رسالہ ۶ میں انجمن ارباب ذوق لائل پور سے مل سکتا ہے۔

رباعیات عرش فاروقی | مجموعہ ہے جناب عرش بریلوی کی ستر رباعیوں کا جن میں ہر رباعی کی ردیف ”جوانی میری“ ہے۔ چونکہ عرش نے عین عالم شباب میں انتقال کیا تھا اس لئے ان کی یہ جوانی والی رباعیاں حقیقتاً ان کے شباب کا مرثیہ ہیں جو ایک خاص کیفیت اپنے اندر رکھتی ہیں۔

سید الطاف علی صاحب بریلوی نے سلطان جہاں منزل علی گڑھ سے انھیں شائع کیا ہوا اور چار آنہ قیمت مقرر کی ہے

مسلمان کیا کریں | مدینہ میں ایک سلسلہ مضامین اس عنوان سے شروع ہوا تھا جس پر مختلف حضرات نے اظہار خیال کیا تھا۔ یہ انھیں ہیں سے چودہ حضرات کے مقالوں کا مجموعہ ہے جسے حلقہ ادب لکھنؤ نے شائع کیا ہے۔

ابوقت ہندوستان کے مسلمان جس دور سے گزر رہے ہیں وہ سیاسی نقطہ نظر سے نہایت اہم ہے اور ہمارے یہاں صحیح فکر و مخلص لیڈروں کے فقدان نے اسے اور زیادہ اہم بنا دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ انفرادی حیثیت سے ہر شخص اس مسئلہ پر غور کرے اور کسی نتیجہ تک پہنچے۔ یہ مجموعہ ایسے متجسس لوگوں کے لئے بہت مفید و کارآمد ہے۔ اس کے مصنف جناب مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی نے ثابت کیا ہے کہ سو پہ در اس **اس میں اردو** میں اردو زبان صدیوں سے مروج ہے اور وہاں بڑے بڑے شاعر و دانشور داز پیدا ہو چکے ہیں۔

اس وقت جبکہ زبان کا مسئلہ تمام اہل ملک کے سامنے پیش ہے اس کتاب کی اشاعت بہت مفید ثابت ہوگی اس میں سیکڑوں ایسے مدراسی شعراء کا تذکرہ پایا جاتا ہے جن کو اس وقت تک کوئی جانتا بھی نہ تھا، اس لئے یہ کتاب فنی حیثیت سے بھی اردو زبان کے لئے بڑا مقتدر اضافہ ہے۔ قیمت پھر ہے اور ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن۔ **دفتر دیوانی سرکار عالی** حیدر آباد میں ایک خاص دفتر ہے جس کو دفتر دیوانی کہتے ہیں۔ اس کا تعلق اس قسم کی دیوانی سے نہیں ہے جو برطانوی ہند میں قرض و سود کی ڈگریاں دیا کرتی تھیں بلکہ اس میں تمام وہ فرامین، توقیعات، پروانے، اور اسناد وغیرہ محفوظ ہیں جو کسی وقت عہد مغلیہ میں شاہان مغل یا سلاطین آصف جاہی کی طرف سے جاری ہوئے تھے۔

مولوی خورشید علی صاحب موجودہ ناظم دفتر دیوانی نے اپنی غیر معمولی کاوش و جستجو اور اس سے بھی زیادہ اپنی خوش سلیقگی و حسن ذوق سے کام لیکر اس دفتر کو ایک ایسے ”نوادر گاہ“ کی حیثیت دیدی ہے جس کی اہمیت کا اندازہ دیکھنے ہی کے بعد ہو سکتا ہے۔ اس دفتر میں تاریخ عہد مغلیہ کے متعلق ایسے ایسے نادر کاغذات محفوظ ہیں جن کا علم ہی اس وقت تک کسی کو نہیں ہوا اور جن سے تاریخ ہند لکھنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

زیر نظر مجلد میں انھیں میں سے بعض فرامین و اسناد کی بات ٹون تصاویر پیش کی گئی ہیں جو آرٹ پیپر پر نہایت نفاست سے طبع کی گئی ہیں۔ اس مجلد کے پیش کرنے سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دفتر دیوانی کتنی اہم خدمت انجام دے رہا ہے اور جس وقت چھان بین کے بعد تمام قدیم اسناد و فرامین سلسلہ وار مرتب ہو جائیں گے تو تاریخ کا ذوق رکھنے والوں کے سامنے کتنا بڑا مادہ ذخیرہ مواد تاریخی کا آجائے گا۔ **مصنفین اردو** | حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی نے اس نام سے اردو کے تمام اگلے پچھلے شعراء و مصنفین کے

مختصر حالات معہ ان کی تصاویر کے شائع کئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کی تالیفات کی بھی فہرست دی ہے۔ عہد حاضر کے بھی تمام مصنفین اس میں نظر آتے ہیں۔ پبلشر نے جس محنت سے اس فہرست کو مرتب کیا ہے اسکی داد نہ دینا ظلم ہے۔

لالہ رخ | دوسرا ڈیشن ہے جسے کتب خانہ علم و ادب دہلی نے شائع کیا ہے اور نہایت عمدہ طباعت و کتابت کے ساتھ مصوّر و مجلد شائع کیا ہے۔

جناب لطیف اکبر آبادی کی اس کتاب سے قارئین نگار اچھی طرح واقف ہیں اس لئے کسی تہمید کی ضرورت نہیں۔ قیمت دو روپیہ ہے۔

اتاترک | غازی مصطفیٰ کمال اتاترک کی سیرت پر اردو میں سب سے آخرین کتاب ہے جس میں عصمت انونویشن اتاترک کے بھی مختصر حالات، درج کردئے گئے ہیں۔ اتاترک دنیا کی ان مخصوص ہستیوں میں سے تھا جس پر ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھا جائے گا اور دنیا مختلف حیثیتوں سے اسے یاد رکھے گی۔ یہ کتاب جناب محمد مرزا دہلوی کی تالیف ہے اور بادیہ و مختصر ہونے کے بہت جامع ہے، اس بطل اعظم کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جو ترک کر دیا گیا ہو۔ فاضل مولف نے کافی محنت و کاوش سے اس کو مرتب کیا ہے اور زبان و انداز بیان بہت شگفتہ ہے۔ متعدد تصاویر بھی شامل ہیں اور طباعت و کتابت بہت پسندیدہ ہے۔ قیمت دو روپیہ اور پلے کا پتہ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔

پھول والوں کی سیر | اس رسالہ میں مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے دکھایا ہے کہ بہادر شاہ ظفر کے زمانہ میں ”پھول والوں کی سیر“ کیا معنی رکھتی تھی۔ یہ دہلی کا مشہور میلہ ہے جو اب بھی شاید ہوتا ہے لیکن شایان دہلی کے زمانہ میں تو وہ ایک مستقل رنگینی تھا، جس کے اظہار کے لئے مرزا فرحت اللہ بیگ ہی کی ٹکسالی زبان کی ضرورت تھی۔ قیمت ۲ روپے

ہندوستان کی صنعت و تجارت | تصنیف ہے جناب منت اللہ صاحب رحمانی ام۔ ال۔ اے کی جس میں انھوں نے پہلے نہایت محنت و کاوش سے یہاں کی صنعت و تجارت پر روشنی ڈالی ہے اور پھر بتایا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی آمد سے اسے کتنا نقصان پہنچایا اور انگریزوں نے کس کس طرح اس کو تباہ و برباد کیا۔

ہماری سیاسی تربیت کے لئے ایسی کتابوں کا مطالعہ از بس ضروری ہے اور ملک کو فاضل مصنف کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ انھوں نے اس خدمت کو بوجہ احسن انجام دیا۔ اس کی قیمت ۱۲ روپے اور پلے کا پتہ مکتبہ سینیہ۔ موئگیر (بہار)

بعض نئے رسایل و جہراپد | اس دوران میں لکھنؤ کی شیعہ سنی نزاع نے اتنے اور ایسے عجیب و غریب

رسائل و اخبار یہاں کی سرزمین سے پیدا کئے کہ لاہور بھی شکست کھا گیا، لیکن حشرات الارض کی طرح پیدا ہوئے تھے اور آخر کار انھیں کی طرح فنا ہو گئے۔ لیکن اسی زمانہ میں بعض ایسے پرچے بھی رونما ہوئے جنکا ذکر ضروری ہے یہاں کے ہفتہ وار اخباروں میں صداقت و پرچم کا اضافہ ہوا ہے۔ صداقت کی پالیسی وہی ہے جو حقیقت کی لیکن پرچم سوشلسٹ جماعت کا پرچہ ہے اور اپنی خصوصیات کے لحاظ سے شاید ہندوستان کا ایک ہی پرچہ ہو۔ مدیر سبط حسن صاحب ہیں اور ان کے دست و بازو جناب مجاز و علی سردار جعفری ہیں۔ ان تینوں پرچوں میں نوجوانوں نے جس ولولہ عمل کے ساتھ اس کو جاری کیا وہ ہر طرح مستحق ستائش ہے اور ملک کو اس کی قدر کرنا چاہئے انھیں لوگوں نے نیا ادب کے نام سے ایک ماہنامہ بھی جاری کیا ہے جو اس دور کے ترقی پسند مصنفین کے بہترین افکار پیش کرتا رہتا ہے۔ پرچم اور نیا ادب میں جو زبان استعمال کی جاتی ہے وہ بادر و سادگی کے اپنے اندر خاص روح رکھتی ہے اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ملک میں لٹریچر کا جو یہ نیا دور شروع ہوا ہے وہ بہت جلد اپنی جگہ پیدا کر لے گا۔

یونپ کی حکومت کی طرف سے کاشتکاروں کیلئے ایک ماہنامہ پرچہ ہل کے نام سے جاری ہوا ہے جو انڈین پرس الہ آباد سے شایع ہوتا ہے اور اپنی ترتیب، اپنے مضامین اور اپنی تصاویر کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ نہ صرف کاشتکار بلکہ ہر شخص کے مطالعہ میں آئے۔

منیہ و دلکش نظمیں، پر از معلومات مقالے، کار آمد افسانے، تہنی مسائل، صناعی و تجارتی نکتے، سمجھی کچھ اس میں ہوتا ہے اور جو کچھ ہوتا ہے نہایت سلیقہ سے پیش کیا جاتا ہے۔

بالکل اسی قسم کا ایک رسالہ ”ہونہار“ پٹنہ سے بھی شایع ہوتا ہے اور گو اس کی ضخامت ہل سے کم ہوتی ہے، لیکن اور تمام حیثیتوں سے وہ کسی طرح اس سے کم نہیں ہے۔ اس قسم کے رسائل و جرائد کا شایع ہونا ملک کی ذہنی ترقی کا ثبوت ہے اور اہل ملک کا فرض ہے کہ ان کی قدر کریں۔

ایک اور ہفتہ وار یہاں سے شایع ہوتا ہے جس کا نام ہندوستان ہے۔ یہ کانگریسی اصول کا حامی ہے اور نہایت خبری سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔

پیام نسواں لکھنؤ ہندوستانی خواتین کا ایک ترقی پسند ماہوار رسالہ جس میں ہندوستان کی مشہور خواتین اور ادیبوں کے اعلیٰ علمی و ادبی مقالے، اخلاقی و معاشرتی افسانے، مزاحیہ مضامین روح نواز نظمیں، نجوم و قیافہ کی دلچسپیاں، طبی معلومات اور کشیدہ کاری کے خوبصورت نمونے اور گھڑتی زندگی کے مسائل پر اہم بحثیں شایع ہوتی ہیں۔

پیام نسواں

راجہ بیگم نگار اور شمیم آرا بیگم نجمہ کی ادارت میں ہر ماہ ۱۵ تاریخ کو پابندی کے ساتھ شایع ہوتا ہے۔ کتابت خوبصورت۔ طباعت و لفریب کا انداز سفید چمکا۔ سالانہ چندہ دو روپیہ۔ نمونہ مفت

مینجر پیام نسواں۔ حلقہ اشاعت لکھنؤ

شاعر اور پیہا

خاموش او پیہیے، دل میرا جل رہا ہے
آواز تیری ایسی پر درد ہو رہی ہے
شاخیں لچک رہی ہیں، گلشن مہک رہی ہیں
اٹھلا رہی ہیں بادل سوئی ہوئی فضا میں
نوخیز پتیوں سے بوندیں ٹپک رہی ہیں
کلیاں چٹک رہی ہیں، مدھوش ہیں ہوائیں
بوندیں پہاڑیوں پر چھاگل بجا رہی ہیں
تو "پی کہاں" کا نغمہ جس دم الپتا ہے
گلشن میں تیرا نغمہ اک ساز بن گیا ہے
باغوں میں زندگی تو اپنی گزرتا ہے،
کیا نخل زندگانی تیرا اُجڑ گیا ہے،
کیا سوزش محبت تجھ کو لڑا رہی ہے
کیوں ہل گئے یکایک شاخوں پتیرے شہر پر
مجھ غم نصیب کو کیا تو جانتا نہیں ہے

میری رگوں میں تیرا نغمہ مچل رہا ہے
جیسے کہ کوئی حسرت سینے میں سو رہی ہے
بد مست وادیوں میں جھونکے بہک رہی ہیں
ہلکی سی راگنی کی آواز ہے ہوا میں
سرسبز ساحلوں کی آنکھیں جھپک رہی ہیں
چبھتی ہیں درد بنکر دل میں تری صدا میں
کالی گھٹائیں تجھ پر آنسو بہا رہی ہیں
اہر سیہ کے اندر خورشید کا پنتا ہے
تو دل کے ٹوٹنے کی آواز بن گیا ہے
برکھاکے مست جوگی؟ کس کو پکارتا ہے؟
کیا "پی" ترا پیہیے! تجھ سے بچھڑ گیا ہو؟
اپنے پیالے کی تجھ کو کیا یاد آرہی ہے؟
کیا دیکھتا ہے مجھ کو تو پتیوں سے جھک کر
میں ہمنوا ہوں تیرا پیچا پتا نہیں ہے؟

اُجڑے ہوئے دنوں میں اک سرو آہ بھریں

آ، دونوں اپنے اپنے پتیم کو یاد کر لیں

شرف احمد خاں سروش طبع آبادی

آہنگِ نشاط

گھئی کے چراغِ دل میں جلائے ہوئے ہوں میں
ہر سمت اک چین سا کھلائے ہوئے ہوں میں
فرشِ زمیں پہ آنکھیں بچھائے ہوئے ہوں میں
جی بھر کے آج سپاس بچھائے ہوئے ہوں میں
مہرِ وفا کو گھر میں چھپائے ہوئے ہوں میں
آنکھیں تجلیوں سے لڑائے ہوئے ہوں میں
جنت کے پھول گھر میں کھلائے ہوئے ہوں میں
عطرِ وفا سے گھر کو بسائے ہوئے ہوں میں
سو حشر ایک ساتھ اٹھائے ہوئے ہوں میں
اب بے حسوں کی نیند اڑائے ہوئے ہوں میں
دونوں جہاں کو سر پہ اٹھائے ہوئے ہوں میں
بازمی حسن و عشق جمائے ہوئے ہوں میں
کتنا بلند دل کو اٹھائے ہوئے ہوں میں
مٹھی میں روز و شب کو دبائے ہوئے ہوں میں
ہر سمت دامِ عشق بچھائے ہوئے ہوں میں
لاکھوں غموں کو ہنس کے بھلائے ہوئے ہوں میں

روٹھی ہوئی خوشی کو منائے ہوئے ہوں میں
حسرت، جو کل تھی، آج نگاہوں کا بار ہے
محوِ خرامِ ناز ہے، بانوے شہرِ حسن
مدت سے میں تھا، تشنہ نظارہ حبیب
رہ رہ کے گھورتے ہیں مجھے ماہ و مشتری
ذوقِ نگاہ، آج ہے کس درجہ کامیاب
فصلِ بہار، خود مری حلقہ بگوش ہے
ہکا ہوا ہے، ہر در و دیوار آج کل،
رنج پر نظریں، باہوں میں ہاتھیں ہیں، دل میں دل
برسوں مرے غموں کا اڑایا گیا مذاق،
ہے سوچ میں فلک تو زمیں دم بخود سی ہے
کس کی مجال ہے کہ چلے چال اب کوئی
ہر نظم، ہر نظام ہے، قابوئے عشق میں
ٹھہرا ہوا ہے وقت، زمانہ رُکا ہوا
سہما ہوا ہے ہوش بھی زعمِ نشاط سے
بے محو دل سے، بے سرو سامانی حیات

ماضی کے غم پہ اب ہیں مرے فقرہ بائے چُست
اپنے فریبِ آپ ہی کھائے ہوئے ہوں میں

فطرتِ واسطی

طاسم خیال

(ایک بچہ کو "کھلونا محل" بناتے ہوئے دیکھ کر)

آہن گداز عزم، فلک رس پروگرام
ہر اضطراب و جوش کا خلاق سہے خیال
کیف! ایک شاہراہ حسین ہے خیال کی
شب تابی نجوم کا اندازہ زر نگار
عشق بلا نواز کا پیسا نہ جنوں،
شمع خموش لب کا آقا خدائے آتشیں
حلقے ہیں اک حسین و دل آویز جال کے
حیرت کا اک چمکتا ہوا، سیم گوں سحاب
زہد اک جواں خیال کا رنگ زوال ہے
ہیں شوخی خیال کی رنگیں جسا رتیں،
کون و مکان گماں کی فضا کا غبار ہیں،
ما مختتم ہے سلسلہ ان واقعات کا
لے جایزہ خیال کا، اک اور قصردھال
موجود ہو ذرا سی مرے میکدہ کی چیز
اک عزم آہنی ہے مرا خواب شعریت
اس گیت نے سمیٹ لیا سب متاع ساز

بنتے ہیں کارگاہ تخیل میں صبح و شام
ہر بجر کے خروش کا خلاق ہے خیال
ہوش! ایک اصطلاح ہے فکر آل کی
نہاب و کھکشاں کے معانی کا اعتبار
امن سکوں رہا کے اشارات کا فسون
پروانہ خیمت کی جلتی ہوئی جہیں،
ہیں دائرے تمام طلسم خیال کے
ہے فلسفہ خیال کے چہرے کا اک حجاب
ذوق گناہ ایک شگفتہ خیال ہے
یزدان و اہرمن کے جسد کی حرارتیں
دیر و حرم ضعیف سے دو اعتبار ہیں
تعمیر و ریخت ایک جنوں ہے حیات کا
ننھا سا تیرا ذہن ہے اور اُس میں یہ اُبال
لیکن تری حیات کے ایوان میں اسے عزیز
ہو فلسفہ کے قصر میں اک باب شعریت
ہے شاعری خیال کا اک سجدہ نیاز

دستِ عمل پہ شعر کا سایہ بھی چاہئے
تفصیل کی جہیں پہ کنا یہ بھی چاہئے

ع

جبریل و ابلیس کی جنگ

کہا ہے مجھ سے یہ ابلیس نے بزم و قمار
کہا تھا اُس نے یہ جبریل سے کہ اسے جبریل!
وے خبر نہیں تجھ کو ترا امت عام ہے کیا
میں چاہتا ہوں کہوں تجھ سے ہست و بود کا راز
اسی خودی سے ہوا ہوں میں صاحب اشراق
جہان ذکر کے اندر ہے کم تری آواز
مقام غور ہے نہتی کا درس لے جبریل
یہ سن کے اٹھ گئی جب پریل کی نگاہ کبود
”خوش کردوں ابھی شمع گم رہی افروز
یہ سن کے ہو گیا ابلیس تہذ شعلہ ناب
بر بہشت ہوئی ایسی جنگ آتش ناک

کاوش حیدر آبادی

عورتوں کا سلیقہ اور بچیوں کی ہنرمندی دیکھنا ہوتا ان کے گھروں میں جا کر کشیدہ کاری
کے نمونے دیکھئے۔ خوشنما نمونے خوش مذاقی اور سلیقہ کی شہادت دیں گے اور
بدنما نمونے بد مذاقی اور بچھوڑن کا پتہ دیں گے۔ آپ اپنی لڑکیوں کو کیا بنانا چاہتے ہیں۔ ہنرمند یا بے ہنر؟ اگر ہنرمند بنانا
ہے تو آج ہی نواب ذکیہ سلطانہ کی مشہور کتاب حسین کشیدہ کاری منگا کر گھر میں رکھئے اور اس سے فائدہ اٹھا لیتے۔
اس کتاب میں خوشنما کٹاؤ دار گریبان۔ گھر۔ کف۔ میز پوش۔ پلنگ پوش۔ رومال۔ غلاف۔ دوپٹوں۔ کتبتوں۔
اور سیکڑوں قسم کے حسین و خوبصورت پھول۔ ڈیزائن اور بلیس تیار کرنے کے اعلیٰ نمونے درج ہیں۔
لکھنؤ کی ہر خوش مذاق لڑکی حسین کشیدہ کاری کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے۔ آپ بھی اس کتاب
کو خرید کر اپنی لڑکیوں اور بیویوں کو دیکھئے۔

رعایتی قیمت بارہ آنہ (ٹکٹ بھیج کر ہم سے فوراً منگائیے) دی پی میں چھ آنہ زیادہ صرف ہوں گے۔

مینجر صلحہ اشاعت۔ زنبور خانہ۔ لکھنؤ

غزلیات

فراق گورکھپوری

آستانِ یار سے ہم آج اٹھ جائیں گے کیا
عشق اک زنداں سہی اتنا بھی گھبرائیں گے کیا
لوگ کچھ ہم تک ہمارے بھی خبر لائیں گے کیا
ہم نگاہ ناز کی باتوں میں آجائیں گے کیا
ایسے میں بھی کچھ تامل سا وہ فرمائیں گے کیا
سب بجا شرح و بیاں ہم ان کو سمجھائیں گے کیا
ہم نیازِ عشق کی حد سے بھی بڑھ جائیں گے کیا
دیکھنے والے تری آنکھوں کے شرمائیں گے کیا
اس جگہ بھی در بدر کی ٹھوکریں کھائیں گے کیا

یہ نہیں ہوتی تھی حالتِ جانبِ در دیکھ کر
حسن بے پایاں سہی اس درجہ کیوں مایوس ہوں
اب صدائے خلوت کا انداز بھی مانوس ہے
یہ تبسم یہ تکلم یہ اشارات نہ ہوں
چھوٹتا ہے اُن کا در - ہوں اک نظر کا منظر
عشق کی باتیں سمجھنے کی نہ سمجھانے کی ہیں
اپنے تسلیم و رضا پر شرم سی آنے لگی
انگلیاں اٹھیں زمانے کی نگاہیں بھی اٹھیں
دل کی ہیں آبادیاں بتا بیاں ہیں عشق کی

سنئے آئے ہیں حسابِ دوستانِ در دلِ فراق
کار و بارِ عشق میں کھوئیں گے کیا پائیں گے کیا

انجم رضوانی :-

بندے کے جمالی پکیر میں انوارِ خدا کو دیکھتا ہوں
کچھ روزا بھی خاموش ہوں میں کچھ اور خدا کو دیکھتا ہوں
میں اپنی خطا پر نادم ہوں اور تیری عطا کو دیکھتا ہوں
دنیا کو اٹھنے سے پہلے میں اُسکی رضا کو دیکھتا ہوں

اک نور مجسم سامنے ہے ترکیبِ ضیا کو دیکھتا ہوں
میں آہ کروں تا شیر نہ ہوں میں روؤں اور طوفان نہ اٹھے!
مانگا نہیں اور بخشا تو نے یہ لطف تیرا یہ شان تری
احباب نہ محو حیرت ہوں بے وجہ سکوت نہیں میرا

اُٹھتی ہے نگاہ ہے پر و اب خیر نہیں رضوانی کی
بیباک نظر کی جنبش میں بیرحم قضا کو دیکھتا ہوں

بازارِ بکری

نیاز فوری کی دیگر تصانیف

ترغیبات خبسی (۱۱) شہواتیات اس کتاب میں خفاشی کی تمام نظری اور غیر نظری قسموں کے حالات انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر بھاری شرح و بسط کے ساتھ تحقیقات تحریر کیا گیا جو ہمیں بتایا گیا کہ خفاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی۔ نیز کہ مذاہب عالم نے اس کے رواج میں کتنی رد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے قیمت تین روپیہ (۳۰) علاوہ محصول خریداران نگار سے دو روپیہ کم	مجموعہ متفلسفہ اور جوابیہ جلد ان تینوں جلدوں میں سلسلہ سے لیکر سلسلہ تک کے متفلسفہ اور جوابیہ تصانیف کے لئے ہیں۔ اس مجموعہ کی اہمیت کا اندازہ یہ ہو گا کہ جو شخص اس مجموعہ میں اس باب میں عامل ہے وہ کتنی ہی شخصی نہیں ان تینوں جلدوں میں سینکڑوں ادبی تاریخی و تحقیقی مسائل متامل ہیں اور اسکی حیثیت ایک مختصر سی سائیکل پیڈیا کی ہے قیمت فی جلد تین روپیہ (۳۰) علاوہ محصول خریداران نگار سے دو روپیہ کم	جذبات بھاشنا جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی سٹا اعری کنوینشن پیش کر کے ان کی اسی تشریح کی ہے کہ دل جیتا ہے ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب ہے۔ موضوع پر لکھی گئی ہے اور ہندی کلام کے سب سے نئے نئے نظریات آتے ہیں۔ قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ (۱۲) خریداران نگار سے دو روپیہ کم	فلاسفہ قدیم اس مجموعہ میں مغربہ نیاز کے یقین نامی مضامین شامل ہیں۔ اس چار گونہ فلاسفہ قدیم کی روشنی کے ساتھ ۱۔ یونانی کا مذہب ۲۔ عورت کے کونے نہایت مفید و دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (۱۰) علاوہ محصول خریداران نگار سے دو روپیہ کم
شاعر کا انجام	فراست الید	مذاکرات نیاز	گوارہ تمدن
جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں۔ یہ فسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی قیمت دس روپیہ (۱۰) علاوہ محصول خریداران نگار سے دو روپیہ کم	مولفہ نیاز فوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص باسانی فائدہ کی شناخت اور اس کی لپیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل سیرت عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی وغیرہ پر سچ پیشین گوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ (۱۰) علاوہ محصول خریداران نگار سے دو روپیہ کم	یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالمگیر کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شش و دو گونہ دینا آخر تک پڑھ لینا ہے۔ اس کتاب کی بہت کم جلدیں باقی رہ گئی ہیں۔ قیمت بارہ روپیہ (۱۲) علاوہ محصول خریداران نگار سے تین روپیہ کم	یہ وہ معرکہ آلا کتاب ہے جس میں تاریخ و اساطیر ثابت کیا گیا ہے کہ تمدن کی ترقی میں عورت نے کتنی زبردست حصہ لیا اور دنیا کے تہذیب و شائستگی اس کی کس قدر معنوں پر اردو میں اس موضوع پر اس قدر قبل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی بھگت کو اس کتاب پر ریاست ہند پال ایک ہزار روپیہ انعام ملا تھا۔ قیمت دو روپیہ (۲۰) علاوہ محصول

نفس المزاج لوگ

طب یونانی سے کیوں برداشتہ خاطر ہیں

صرف اس لئے

کہ بعض دواخانے دو ایٹموں سے زیادہ کوڑے کرکٹ کا

گھربے رہتے ہیں مگر بقصد

طیبی دواخانے میں صفائی کا بہترین انتظام ہے۔ مرکبات سائنٹفک طریقہ پر تیار کئے جاتے ہیں جن کی عمدگی اور نفاست مسلمہ ہے۔ بڑے بڑے مشاہیر دواخانہ کا معائنہ فرما کر اپنی بہترین رائے کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے خاص مرکبات اور صدی نسخہ جات طب یونانی کا معجزہ کہلانے کے مستحق ہیں۔ فہرست مفت۔ آزمائش اور طب یونانی کی سرپرستی فرمائیے!

طیبی دواخانہ یونانی

قائم شدہ ۱۸۱۵ء

چوک بازار - اندور

سارکاپتہ "شاہی" اندور

قائم شدہ ۱۸۱۵ء

۶۶ محمد علی روڈ بمبئی ۲

ٹیلیفون نمبر ۲۶۹۸۳

شاہجہاں پور و پٹنہ و شری گنگا پور و کھنوا